OCTOBER
2024
جدید شعروادب کا نمائندہ
ماہنامہ
بیاض
لاہور

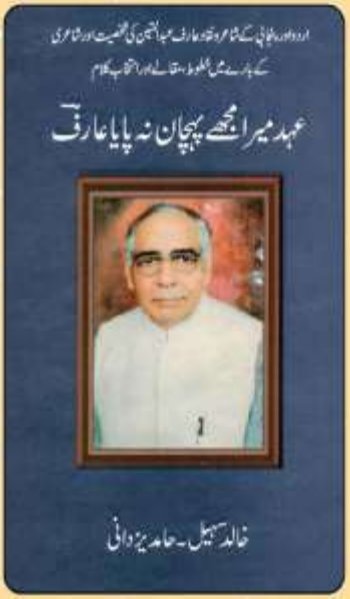

عہد میرا مجھے پہچان نہ پایا عارف
خالد سہیل ۔ حامد یزدانی

تنقیداتِ حمد و نعت
نسیم سحر

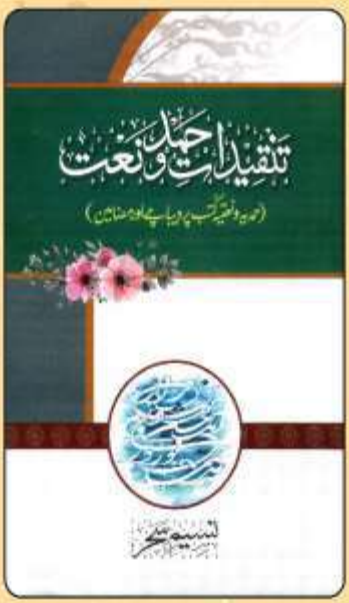

فتح محمد ملک کی تنقید نگاری
منتخب تنقیدی مضامین
ترتیب و تدوین
ڈاکٹر نثار ترابی

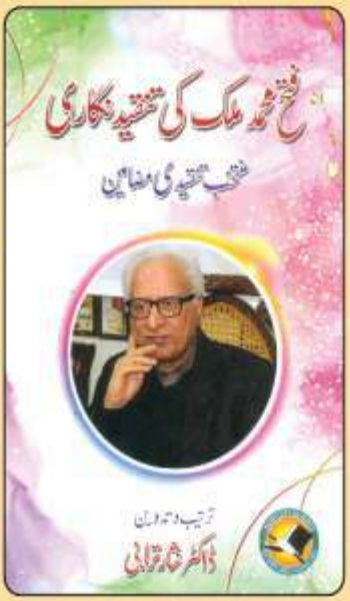

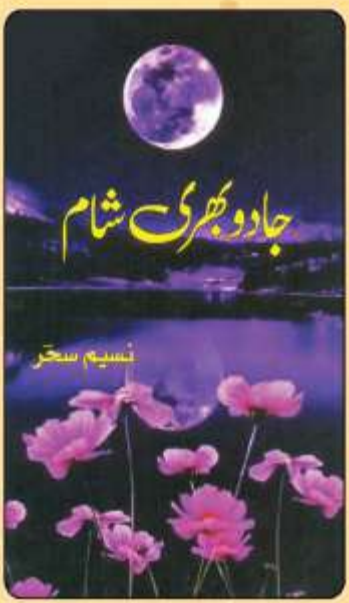

جادو بھری شام
نسیم سحر

بانی مدیر: خالد احمد

غزل

اس شہر میں حدِ رم و رفتار کہاں تھی
زندان ستم کی کوئی دیوار کہاں تھی

کیا جانیئے کس لمس نے گونگوں کو زباں دی
کل تک ترے سکّوں میں یہ جھنکار کہاں تھی

یہ بات کسی طور نہ آ پائی پلک تک
اے اشک! مری دولتِ اظہار کہاں تھی

کیا دن تھے کہ گلیاں سمٹ آئی تھیں گھروں میں
یہ دھوپ سرِ کوچہ و بازار کہاں تھی

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

Karachi: (021) 34541301-7 **Lahore:** (042) 36363300-7
Sialkot: (052) 3554301-6 **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
Faisalabad: (041) 8542924 **Peshawar:** (091) 5606565 **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا نقیب

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 32 - اکتوبر 2024 - شمارہ نمبر: 10

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد عمار ٹیکسٹائل اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	نعت	ریاض مجید، آصف ثاقب، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، زاہد فخری، شوکت محمود شوکت، ذکی طارق، اشرف نقوی، نبیل احمد نبیل، زبیر خیالی، شیخ اقبال، افضال انجم، حسنین مظہری	7 تا 20
2	عقیدت	خاور اعجاز، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، اکرم ناصر، رضا اللہ حیدر، مرزا آصف رسول، فیض رسول فیضان، صغیر احمد صغیر	21 تا 28
3	رباعیات	محمد نصیر زندہ	29
4	قطعات	انعام الحق جاوید	30
5	ہائیکو	طٰہٰ غفور	31
6	مضامین	جلیل عالی، ابدال بیلا، خاور اعجاز، خالد علیم، تسنیم سحر، اصغر ندیم سیّد، نثار ترابی، اسد محمود خان، طالب انصاری، ہارون الرشید، علی رضا، طاہر حسین قادری، راجہ شاہد رشید، ظفر اقبال ظفر، محمد کلیم	32 تا 99
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	100 تا 108

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
8	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، جلیل عالی، اعجاز کنور راجہ، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، زاہد فخری، شارق ترابی، مسعود احمد، محمد انیس انصاری، خورشید ربانی، طالب انصاری، اجمل اعجاز، راحت سرحدی، افتخار شاہد، فرحت عباس شاہ، احمد جلیل، شاہین عباس، رخشندہ نوید، منظر اعجاز، شبہ طراز، اعجاز روشن، محمد آصف شفیع، طلعت شبیر، اکرم سحر فارانی، محمد سلیم ساگر، مظہر امام، عقیل رحمانی، ذکی طارق، طاہر ناصر علی، شوکت محمود شوکت، شاہد ماکلی، ریاض ندیم نیازی، محمد نوید مرزا، انصر حسن، عاطف جاوید عاطف، محمد شفیق انصاری، خالد ندیم شانی، نبیل احمد نبیل، علی حسین عابدی، قمر بشیر، سرور فرحان، دانش عزیز، اصغر علی بلوچ، علمدار حسین، افضل ہزاروی، شاہد فرید، دلشاد احمد، مستحسن جامی، محمد اشفاق بیگ، رانا سعید دوشی، اورنگزیب حسام حر، عاصم اعجاز، عظمیٰ نقوی، جنید آذر، جیا قریشی، نوید عاجز، وسیم جبران، صغیر احمد صغیر، راجہ عبدالقیوم، ہمایوں پرویز شاہد، اشرف نقوی، سید ضیا حسین، شیخ اقبال، غضنفر مہدی، بشیر احمد حبیب، محمد اشرف کمال، انصر رشید انصر، عبدالرؤف زین، میتھیو محسن، نعیم رضا بھٹی، اعجاز روشن، اسد رضا سحر، اسیر حیدر، حنا بابر، امتیاز انجم، نعمان محمود، اعجاز رضوی	109 تا 186
9	طنز و مزاح / خاکے	ہمایون خان	187 تا 190
10	افسانے	اسلام عظمی، بلقیس ریاض، محمد نوید مرزا، صائمہ ناصر [شیخ ہدم / مترجم: ابن حسین شعیب الرحمٰن]، محمد ضیا المصطفیٰ	191 تا 217
11	نظمیں	خالد احمد، سید افسر ساجد، جلیل عالی، خالد علیم، محمد انیس انصاری، صفدر صدیق رضی، نذر عابد، رخشندہ نوید، افتخار شوکت، تسلیم کوثر، وردانہ نوشین خان، نائلہ راٹھور، ظہور چوہان، امجد بابر، کوکی گل، فصیحہ آصف خان، دلشاد احمد، عاصم بخاری، عظمیٰ نقوی، کشمالہ گیلانی، شمیلہ سعید، شائستہ رمضان، نوید صادق، اعجاز رضوی	218 تا 241

نعتؐ

ہو وظیفہ یہی معمول مرا کثرت سے
وِرد ہونٹوں کا رہے 'صلِّ علیٰ' کثرت سے

لفظ محدود ہیں ، محدود تر ایّامِ حیات
کیسے کر سکتے ہیں ہم اُن کی ثنا کثرت سے؟

وہاں محسوس کیا زائرِ طیبہ! کیا کچھ
اُس خنک شہر کے احوال سنا ، کثرت سے

دُھلیں گے داغ اِسی طور عمل نامے کے
اپنی غفلت پہ دلا! اشک بہا کثرت سے

وہی اک کام جو کثرت سے ہمیں کرنا تھا
حیف ہم سے نہ وہی کام ہُوا کثرت سے

ریاض مجید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزّت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیّت لکھی

نعتیہ ؐ

وفا کے قرینے میں لے کے چلوں گا
نجف ہی سے سیدھا مدینے چلوں گا

ملوں گا ادھر کے بڑے قافلے سے
میں رکتا نہیں آگے آگے چلوں گا

عقیدت سے سب کے قدم اُٹھ رہے ہیں
قدم میں قدم سے ملا کے چلوں گا

جدائی کے صدمے مدینے بتاؤں
نگاہوں میں لے کے ستارے چلوں گا

نظر میں بسے گا وہاں سبز گنبد
میں زخم اپنے سارے ہرے لے چلوں گا

ادھر کو ہیں ثاقب بہت جانے والے
محبت سے ان کو پکارے چلوں گا

آصف ثاقب

نعتؐ

دل جو یادِ حرا جیا ہی نہیں
آشنائے خدا ہوا ہی نہیں

جس کی خاطر یہ کائنات بنی
کون سی شے پہ اُسؐ کی شاہی نہیں

دیکھ لہجہ لبِ رسالت کا
مامتائی ہے انتباہی نہیں

اُن لبوں نے نہ جس پہ جُنبش کی
وہ سمجھ مرضیِ خدا ہی نہیں

جانے کیا دردمندیاں اُسؐ کی
آنکھ رستے جو دل بہا ہی نہیں

جس کو سیرت نہ ہو سکی ازبر
اس پہ قرآں کبھی کھلا ہی نہیں

ایسا صاحب جنوں بھی کیا معنی
اُسؐ کے لشکر کا جو سپاہی نہیں

طائف و بدر کی گواہی ہے
اس کی تعلیم خانقاہی نہیں

اُس درِ خیرِ تام پر عالی
مانگنے کی کوئی مناہی نہیں

جلیل عالی

نعتؐ

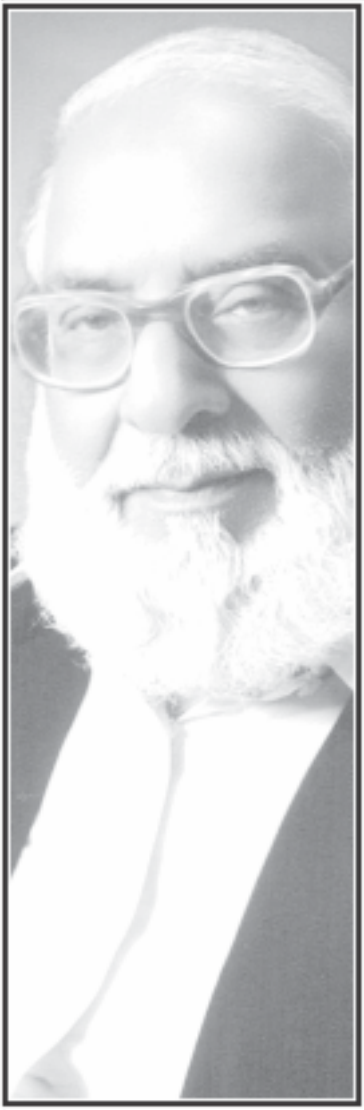

دور ظلمت ہوئی ، آندھیاں چھٹ گئیں
آپؐ آئے تو سب کلفتیں گھٹ گئیں

پیکرِ نور سے خاک روشن ہوئی
اجلے رستوں سے تاریکیاں ہٹ گئیں

آپؐ نے حریت کو توانائی دی
پاؤں چلنے لگے ، بیڑیاں کٹ گئیں

آپؐ آئے تو دنیا میں عید آگئی
ایک اک گھر میں شیرینیاں بٹ گئیں

آپؐ کے فیض سے ان کی بگڑی بنی
جن کی سبکی ہوئی ، عزتیں گھٹ گئیں

آپؐ کی دل نشیں، صحبتِ پاک سے
نفرتوں کی سبھی کھائیاں پٹ گئیں

کائناتوں میں ہر سو اجالا ہوا
بدلیاں تیرہ بختی کی سب چھٹ گئیں

پھر ریاض ان کے اعدا کو ذلت ملی
خیر کی قوتیں ہر جگہ ڈٹ گئیں

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

کتنا بلند تر ہے رُتبہ مرے نبیؐ کا
پہنچا نہیں وہاں تک ذہنِ رسا کسی کا

جب سے درودِ اقدس کی تابشیں ملی ہیں
ہر لمحہ ہو گیا ہے پُرنور زندگی کا

دیکھیں ہیں جب سے میں نے اس شہر کی ضیائیں
بھاتا نہیں ہے منظر اب مجھ کو چاندنی کا

ایسا کرم کیا ہے سرکارؐ دو جہاں نے
نقشہ ہے نقش دل پہ طیبہ کی ہر گلی کا

مجبوریوں کی شورش پھر بڑھ چلی ہے آقاؐ
قصہ سناؤں کس کو سرکارؐ بے بسی کا

پہلی نظر پڑی تھی جب ان کی جالیوں پر
انداز ہی جدا تھا اُس وقت ہر خوشی کا

بخشا ہے تجھ کو کس نے یہ ذوق والہانہ
دیکھا نہیں ہے ہم نے انداز یہ کسی کا

اہلِ نظر بھی اس دم حیرت سے دم بخود تھے
ایسا شرف مِلا تھا عاجز کو حاضری کا

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

نعتؐ

رَبّ کعبہ نے مدینے کو یہ عزت دی ہے
اپنا محبوب دیا اپنی شریعت دی ہے

اک زمانہ ہی نہیں سارے زمانے اس کے
سب جہانوں کو محمدؐ نے محبت دی ہے

ہم جو حق سچ کے لیے جاں سے گزر جاتے ہیں
ہم کو آقاؐ کے نواسوں نے یہ ہمت دی ہے

حب احمدؐ ہمیں اجداد سے ورثے میں ملی
اپنی نسلوں کو یہی ہم نے وراثت دی ہے

جس نے خود جبر کے موسم میں تھا مکہ چھوڑا
ہم کو اس شاہ نے ہجرت کی اجازت دی ہے

اس نے بے سایا سروں پر کیا سایا اپنا
اس نے اجڑے ہوئے لوگوں کو رفاقت دی ہے

اس کے انکار نے کردار سنوارے فخری
اس نے ہر دور کے انساں کو صداقت دی ہے

زاہد فخری

نعتؐ

دل کا سرور ، آنکھ کا ہے نور ، بانوے
دنیائے آب وگل میں ہے مستور، بانوے

ہر درد کی دوا ہے محمدؐ کے نام میں
رکھے دلِ ملول کو ، مسرور ، بانوے

شہرہ ، مرے حضورؐ کا دیکھا ، جبل جبل
غارِ حرا کے ساتھ کہے طور ، بانوے

موقوف ، آسمانی کتب پر نہیں فقط
عالم کے ہر جریدے میں مذکور ، بانوے

غم ہائے روزگار ہوں ، کافور اُس گھڑی
کہتا ہے جس گھڑی دلِ رنجور ، بانوے

پڑھ کر ، درودِ پاکؐ ، بنائے مگس ، عسل
تریاقِ زہرِ عقرب و زنبور ، بانوے

شوکت ، وفورِ شوق سے پڑھتے ہیں روز و شب
جن و ملک ، بشر ہوں ، کہ ہوں حور، بانوے

شوکت محمود شوکت

نعتؐ

ذکی طارق

ہم جو ہیں رحمت بداماں رحمتہ اللعالمیں
آپ کا یہ سب ہے احساں رحمتہ اللعالمیں

بہرِ محشر آپ کی چشمِ عنایت کے سوا
کچھ نہیں ہے ساز و ساماں رحمتہ اللعالمیں

آپ کی آمد سے روشن ہوگئی بزمِ جہاں
ہر سو ہے جشنِ چراغاں رحمتہ اللعالمیں

آپ ہی نے دین و ایماں کی عطا کیں دولتیں
آپ پر یہ جان قرباں رحمتہ اللعالمیں

بخشوا لیں گے خدا سے ہم گنہگاروں کو آپ
ہم سبھی کا ہے یہ ایماں رحمتہ اللعالمیں

اللہ اللہ آپ کی پرواز و رفعت دیکھ کر
ہو گئے جبریل حیراں رحمتہ اللعالمیں

شرحِ آیاتِ مبیں ہے آپ کی اک اک ادا
اے امانت دارِ قرآں رحمتہ اللعالمیں

کیجیے اپنے ذکی طارق پہ چشمِ التفات
یہ بہت ہی ہے پریشاں رحمتہ اللعالمیں

نعتؐ

درود لب پہ ہمارے، اگر نہیں آتا
قسم خدا کی، دُعا میں اثر نہیں آتا

جو ہم نہ سیرتِ احمد سے رہنمائی لیں
تو بخشے جانے کا ساماں نظر نہیں آتا

جنھیں طلب کیا جائے، وہی پہنچتے ہیں
وہاں سے سب کو تو اذنِ سفر نہیں آتا

گدا ہوں اُن کا، سو پلتا ہوں اُن کے ٹکڑوں پر
بغیر بھیک کے میں اپنے گھر نہیں آتا

ہیں منتظر مری دہلیز پر دھری آنکھیں
مرا مدینے سے کیوں نامہ بر نہیں آتا

سُنا ہے جب سے کہ دید اُن کی قبر میں ہوگی
تبھی سے موت کا اِس دل میں ڈر نہیں آتا

اگر نہ آپ کی چشمِ کرم ہو اشرف پر
تو نخلِ جاں پہ کبھی بھی ثمر نہیں آتا

اشرف نقوی

نعتؐ

بھرا ہُوا جو تمناؤں سے یہ جادہ ہے
مجھے حضورؐ کی دل میں طلب زیادہ ہے

میں چھوڑ چھاڑ کے اب سارے کام دُنیا کے
درِ حضورؐ پہ جاؤں گا یہ اِرادہ ہے

رواں دواں ہوں میں جس دن سے جانبِ طیبہ
دل و نگاہ کا آنگن بڑا کشادہ ہے

ہَوا مدینے کی چُھونے لگی ہے جب سے مجھے
بدن کے ساتھ معطّر مرا لبادہ ہے

اُتر رہے ہیں فرشتے سلامیاں دینے
درِ رسولؐ پہ میری جبیں نہادہ ہے

زمانہ شاطر و چالاک ہے بہت کہ نبیلؔ
ہوں خاکسار میں، آقاؐ، یہ دل بھی سادہ ہے

نبیل احمد نبیلؔ

نعتؐ

مِدحتِ سرورِ ذیشان کیا کرتا ہوں
اِس طرح خود پہ مَیں احسان کیا کرتا ہوں

راحت و حوصلہ دیتا ہے خیال اُنؐ کا مجھے
جب کبھی خود کو پریشان کیا کرتا ہوں

اُنؐ کی الفت کے خزاں رُت میں کِھلا کر غنچے
باغِ اُمید کو حیران کیا کرتا ہوں

ذکر کرکے شبِ معراج کی سیاحی کا
اہلِ ایمان کی پہچان کیا کرتا ہوں

میرا اعزاز مُیسر نہ ہُوا موسیٰؑ کو
اپنی نسبت پہ بہت مان کیا کرتا ہوں

عظمتِ نامِ محمدؐ سے خیالی اکثر
راہِ دُشوار کو آسان کیا کرتا ہوں

زبیر خیالی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خیمہ بہ دوش، شانہ بہ کف، خانماں بہ سر
خرگاہِ اہلِ عشق ہیں کوہ و دَمن تمام

نعتؐ

کردار کی دولت ہے نہ حرفوں کا ہنر ہے
حاضر تری درگاہ میں اک دیدۂ تر ہے

اٹھتی ہیں تو اٹھتی ہیں تری سمت نگاہیں
کشکولِ دل و جاں میں نظر ہے نہ خبر ہے

ہے یاد تری مجھ کو بڑھاپے میں جوانی
اور نام ترا آقاؐ مری شب کی سحر ہے

جس میں تری چاہت نہ ہو وہ دل دلِ مُردہ
جس میں تری صورت نہ ہو وہ خاک نظر ہے

اے رحمتِ عالم تو ہی آغوش میں لے لے
تسکین زمانے کو نہ صحرا میں، نہ گھر ہے

لکھ دے مری تقدیر میں طیبہ کے در و بام
اک عمر کا آقا مجھے منظور سفر ہے

نعتِ شہِ لولاک کا صدقہ ہے یہ اقبالؔ
میں بے سروسامان ہوں تسکین مگر ہے

شیخ اقبال

نعتؐ

نعت اک کہنی ہے شایانِ نبیؐ
ہو ہر اک شعر بہ عنوانِ نبیؐ

مجھ کو درکار ہے بخشش اپنی
میں گنا جاؤں ثنا خوانِ نبیؐ

یوں ہی پہنچوں اے خدا محشر میں
ہاتھ سے چھوٹے نہ دامانِ نبیؐ

اپنی ذلت کا سبب ہے معلوم
ہم ہیں بھولے ہوئے فرمانِ نبیؐ

راہ سے کیسے بھٹک سکتا ہے
جس کو حاصل ہوا عرفانِ نبیؐ

کلمہ حق کا ہے لب پر اپنے
یہ فقط ہم پہ ہے فیضانِ نبیؐ

ایک روز اس طرح یہ آنکھ کھلے
خود کو پھر پاؤں میں مہمانِ نبیؐ

میں مواجہ پہ جونہی پہنچوں گا
مجھ کو روکے گا نہ دربانِ نبیؐ

رستہ انجم ہے یہی جینے کا
جئیں ہم بن کے غلامانِ نبیؐ

افضال انجم

نعتؐ

یُورشِ رنج میں جس وقت بھی سر گھومتا ہے
ذکر سرکارؐ کا نس نس میں اثر گھومتا ہے

لائقِ عز و شرف ہے وہ سگِ خوش تقدیر
شہرِ سرکار میں جو شام و سحر گھومتا ہے

باندھ کر گنبدِ خضرا کا تصور مرا دل
ایسا لگتا ہے کہ دنیائے دگر گھومتا ہے

تیری یادوں سے کُھلے سو در امکاں ورنہ
چاک تقدیر پہ ہر ایک بشر گھومتا ہے

جو بھی رکھتا ہے ترے اسوۂ کامل پہ نظر
عرصۂ زیست میں بے خوف و خطر گھومتا ہے

حسرتِ دیدِ مکرر میں شب و روز، ہنوز
آسماں گردِ درِ خیرِ بشر گھومتا ہے

رحمتیں کرتی ہیں اس شخص کی قسمت کا طواف
جستجو میں جو تری آٹھ پہر گھومتا ہے

تو ہے وہ شمعِ فروزاں کہ مہِ چرخ، ترا
ہو کے پروانہ بہ اندازِ دگر گھومتا ہے

ان کو لازم ہے ترے فقر و قناعت کا سبق
جن کی آنکھوں میں فقط منظرِ زر گھومتا ہے

حسنین مظہری

عقیدت

ایک منظر میں سیاہی خیمہ زن ہوتی ہُوئی
دُوسرے منظر میں روشن اِک کرن ہوتی ہُوئی

وقت نے کیسے گوارا کر لیا یہ سانحہ
ساعتِ شہرِ اماں اور بے وطن ہوتی ہُوئی

کس طرح دیکھی گئی ہو گی ہوائے عصر سے
ریگِ صحرا پھول جسموں پر کفن ہوتی ہُوئی

پیاس کے منظر سے اُبھرا ایک دریا بے مثال
بوند بھی جس کی اُفق تک موجزن ہوتی ہُوئی

آنے والے دھوپ صحراؤں پہ سایہ کر گئی
خاک میں پیوند اِک شاخِ بدن ہوتی ہُوئی

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُن کا اِسمِ مُبینؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ وَرق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

عقیدت

تکریمِ رسالت مرے ایمان کی تابش
تکریمِ رسالت گلِ عرفان کی تابش

تکریمِ رسالت سے ہیں ایمان کے انوار
تکریمِ رسالت سے ہیں افلاک ضیابار

تکریمِ رسالت سے ہے ہر پھول میں خوشبو
تکریمِ رسالت سے رواں نعرۂ حق ھُو

تکریمِ رسالت مرے افکار کی مہکار
تکریمِ رسالت میں نہاں خُلد کے اَسرار

تکریمِ نبیؐ خاتمِ دوراں کا نگیں ہے
تعظیمِ محمدؐ سے ہر اک لمحہ حسیں ہے

تکریمِ رسالت کے محافظ ہیں مسلماں
تکریمِ رسالت ہے بقائے دلِ دوراں

تکریمِ رسالت سے ہے ہر قوم کی تکریم
اس نور کی تابش سے ہے ہر فرد کی تعظیم

تکریمِ رسالت سے حسیں خیمۂ افلاک
تکریمِ رسالت پہ فدا ہر دلِ بے باک

تکریمِ نبیؐ ، حاصلِ قرآنِ مُبیں ہے
تکریمِ نبیؐ جلوۂ فردوسِ بریں ہے

یہ بات مری غور سے سُن خُوگرِ توہین
تکریمِ نبیؐ ہے مرا ایمان مرا دین

توہینِ نبیؐ ، دہر میں تاریک فضا ہے
یہ عبرِ ضلالت ہے حماقت کی ہوا ہے

ہم غازی ، مجاہد بھی ، دِلاور بھی بنیں گے
گستاخِ رسالت کو تہِ تیغ کریں گے

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

دعا

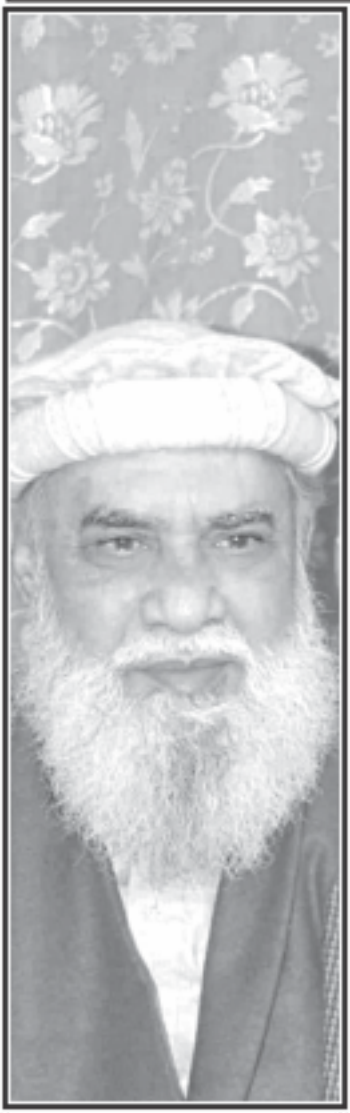

تعبیر کوئی ایسی مرے خواب سے نکال
کشتی کو ربِ کبریا گرداب سے نکال

جو پاک سرزمین کے دشمن ہیں دین کے
ایسے منافقین کو احباب سے نکال

میرے عدو پہ تو مری ہیبت کو طاری رکھ
اور اس کے خوف کو مرے اعصاب سے نکال

مولا تو روک منفی سیاست کی بارشیں
جو گھر چکے ہیں ان کو بھی سیلاب سے نکال

تیری رضا سے ہوتے ہیں دنیا میں سارے کام
مالک تو ہم کو خواہشِ اسباب سے نکال

میری کہانیوں کو دے کردار آج کے
میرے ادب کو رستم و سہراب سے نکال

میرے قلم کو بھی ہو عطا عمرِ جاوداں
دو چار شعر اس سے بھی نایاب سے نکال

اکرم ناصر

عقیدت

اللہ نے بنائی حسیں صورتِ رسول
میرے نصیب، کرتا ہوں میں مدحتِ رسول

ہر سمت روشنی تھی جب آئے تھے مصطفیٰؐ
دل غم سے بھر گئے جو ہوئی رحلتِ رسول

پھر چشمِ تر ادب کے قرینے بتائے گی
قرطاسِ دل پہ نقش کرو عظمتِ رسول

منبر سے بیتِ نبوی تلک ہیں فضیلتیں
جنت کے ایک گوشے میں ہے تربتِ رسول

اب کھینچتی نہیں ہیں یہ شہوات و لغویات
خوش بخت ہوں کہ دل میں رچی الفتِ رسول

کالا کیا اندھیروں کا منہ ماہتاب نے
مکے میں جب ہوئی تھی رضاؔ بعثتِ رسول

رضا اللہ حیدر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

منزلِ عشق ہو گئی، شام دمشق ہو گئی
صبح سے آفتاب تھا، گرمِ سفر برہنہ پا

عقیدت

کہاں یہ میں کہاں حُسنِ کلام صلِ علیٰ
ہے ان کے فضل سے عرض سلام صلِ علیٰ

وہ اوّلین خلائق کہ آخرین رُسُل
انھیں کا عہد ہے دورِ دوام صلِّ علیٰ

کسی کے حق میں نہیں ان سے پہلے حکمِ درود
وہی رسولؐ ہیں خیرالانام صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمدؐ میں یوں ہو گم اے دل
کہ جیسے طیبہ میں ہیں صبح و شام صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمدؐ سے علم ہو روشن
تو فکر میں ہو منوّر مقام صلِ علیٰ

جہاد اب بھی ہو دشنام دشمناں کے خلاف
کہ جیسے نعت تھی پہلے حُسام صلِ علیٰ

وہ حامدؐ و محمودؐ ہیں وہ محمدؐ و احمدؐ
نام ان کا محامد میں نام صلِ علیٰ

کہ الحمید نے جس شان سے ہے بھیجا انھیں
ہے ان کی مدح میں "حمداز مرام صلِ علیٰ"

زباں سے اسم محمدؐ ادا نہیں ہوتا
نہ جب تلک کرے دل اہتمام صلِ علیٰ

نصیب اس کو ہوئی ہے سیادتِ دوراں
جو ساری عمر رہا ہے غلام صلِّ علیٰ

بکھرتے خوابوں پریشاں وفاؤں سے کہنا
ہر انتشار کا حل ہے نظام صلِ علیٰ

جہاں بھی ظلمتِ غم میں ہے زیست اس کے لیے
طلوعِ مہر طرب ہے پیامِ صلِ علیٰ

وہ جس کو سنتِ میلاد مصطفیٰؐ ہے عزیز
ہیں کم وہ جتنے بھی رکھے صیام صلِ علیٰ

پناہ ایسی عقیدت سے اس عقیدے سے
جو بھر لے بادۂ بدعت سے جام صلِ علیٰ

ہے دستِ زہد فروشاں میں دیں کی کب تشہیر
بڑھا رہے ہیں فقط اپنا دام صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمد ہے سب پہ رحم کا درس
کہ ساری خلق خدا ہے عوام صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمدؐ سے ہے خلوص اگر
تو جتنا بھی ہے عمل ہو تمام صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمد تو ہے جہادِ عشق
ہے کامیاب وہ جو ہے بہ کام صلِ علیٰ

درودِ آلِ محمد کا رنگ ہو سب پر
ہے قوم مصطفویؐ با قیام صلِ علیٰ

درود آلِ محمد سے جاں کو زینت دو
کہ ہیں سب اہلِ ارم نور فام صلِ علیٰ

سوئے مدینہ میں قرطاس زندگی پر بھی
رہوں قلم کی طرح خوش خرام صلِ علیٰ

سجائی نورِ محمدؐ سے بزم کن حق نے
فرشتگاں نے کیا التزام صلِ علیٰ

درود آلِ محمدؐ ہے درگزر کا سفر
کوئی کسی سے نہ لے انتقام صلِ علیٰ

سب انتظام تھے ختم الرسل کی جنت تک
اب آگے ہے در دارالسلام صلِ علیٰ

جہادِ علم و ہنر بھی ہے ایک حق ہم پر
ہے قوت اس کی یہ تیغِ نیامِ صلِ علیٰ

صلوٰۃ عشق ہو جس بھی ادا سے یاد رہے
کہ نورِ میرِ اُمم ہے امام صلِ علیٰ

ہیں کیسے دین کے خادم یہ مسجدوں کے فقیر
کہ مانگتے ہیں جہاں سے طعام صلِ علیٰ

سخن پہ داد ہی دیتے ہیں وہ بھی یوں جیسے
چکا رہے ہوں کوئی قرض و وام صلِ علیٰ

ہیں خوش وہ کر کے چراغاں گھروں میں یوں جیسے
کہ ہیں یہی در و دیوار و بام صلِ علیٰ

فدا ہو ساقی کوثر پہ ہر طلب آصف
کہ ہے جام نعت میں "نورِ مدام صلِ علیٰ"

مرزا آصف رسول

عقیدت

یہ ہی نماز میری یہ ہی مرا وضو ہے
میں تیرے رُوبرو ہوں تو میرے رُوبرو ہے

کس کو کہوں میں اپنا، کس کو کہوں پرایا
ہر آئنے میں تیری تصویر ہو بہو ہے

کچھ اور سوچنا بھی مجھ پر حرام ٹھہرا
یا تو ہے میرے دل میں یا تیری آرزو ہے

میری بھی خستہ حالی، رحمت کی ہے سوالی
چرچا تری عطا کا دو جگ میں چار سو ہے

سجدوں عبادتوں میں گم ہیں جہان والے
میری زباں پہ ہر دم بس تیری گفتگو ہے

ہے دل کی دھڑکنوں میں تیری وفا کا ڈیرہ
سانسوں میں تیری خوشبو نظروں میں تو ہی تو ہے

کس پر نہیں ہے آقا! تیری کرم نوازی
تیری عنایتوں سے ہر کوئی سرخرو ہے

فیضانؔ، پنج تنؑ کے دن رات گیت گاؤ
اُن کا ہی صدقہ ساری عزت ہے آبرو ہے

فیض رسول فیضان

عقیدت

مجھ کو آتے نہیں جواب حضورؐ
دے نہ پاؤں گا میں حساب حضورؐ

آپ کے در سے ہے بڑی امید
آپ سے کیا چھپاؤں خواب حضورؐ

جو خطائیں ہیں میرے دامن میں
آپ کر دیں انھیں ثواب حضورؐ

ہر قصیدہ مرا ہے آپ کے نام
آپ کے نام انتساب حضورؐ

سامنے پھر ہے فوج باطل کی
کیجیے ہم کو کامیاب حضورؐ

صغیر احمد صغیر

اے زیبِ زینِ توسنِ زرّیں زمام! رُک
گھبرا کے چھپ نہ جائیں ستارہ سخن تمام

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

رباعیات

فولاد کی تاثیر بدل سکتی ہے
حالات کی زنجیر بدل سکتی ہے
مل جائیں اگر اوجِ محمد کے نقوش
انسان کی تقدیر بدل سکتی ہے

نوکِ خامہ پہ رقص کرتے ہوئے حرف
جی اٹھے دمِ نعت سے مرتے ہوئے حرف
قرآن کے سینے میں ہے والیل کا نور
تصویرِ بیاں میں رنگ بھرتے ہوئے حرف

ہمت کی کمر درسِ وفا پڑھتی ہے
میری مشکل مرا کہا پڑھتی ہے
زنداں میں جو آجاتی ہے طیبہ کی ہوا
زنجیر مری صلِ علیٰ پڑھتی ہے

آؤ کہ رخِ شام و سحر تازہ کریں
تکبیر سے خورشید و قمر تازہ کریں
لو احمد سے مزاحمت کی مشعل
اٹھو کہ اجالوں کا سفر تازہ کریں

خورشید ترے سایۂ انور میں ہے
شاہا ہر ذرہ پسِ منظر میں ہے
اک قطرہ ہے سفینۂ کن فیکون
عالم تری مٹھی کے سمندر میں ہے

بلبل کی زباں گل کے دہن میں آئی
خوشبو کی شوخی پیرہن میں آئی
لفظ و معنی کے ظرف میں رکھی نعت
قرآن کی روشنی سخن میں آئی

فردوس و ارم کو ہم نشیں کر لوں گا
آئینۂ دل کو دور بیں کر لوں گا
میں اوڑھ کے تیرے قریۂ خواب کی دھول
دو عالم کو زیرِ نگیں کر لوں گا

سایہ کوئی زیرِ آسماں آیا نہ تھا
آدم نے لباسِ زندگی پایا نہ تھا
اس کے سایہ نشیں ہوئے کون و مکاں
جس کا روئے زمین پر سایہ نہ تھا

آغوشِ تمنا میں مدینہ آیا
توبہ کے ماتھے پر پسینہ آیا
ناموسِ رسالت میں ہوئی قید حیات
مر کے مجھے جینے کا قرینہ آیا

محمد نصیر زندہ

قطعات

انعام الحق جاوید

بزمِ طرب میں سب سے نہ یکساں سلوک کر
اپنوں کو اور غیروں کو پہچان کم سے کم
بگڑی تھی بات گھر میں تو اغیار کی طرح
تُم تو نہ کرتے شہر میں اعلان کم سے کم

اُترا تھا آسمان سے میں چند روز قبل
اب پھر سے آسمان پہ چڑھنے لگا ہُوں میں
کچھ اور ہی تھے مجھ کو پڑھائے گئے تھے جو
کُچھ اور ہی سبق ہیں جو پڑھنے لگا ہُوں میں

یقیں دلاتے ہیں اُلفت کا، لفظ تولتے ہیں
اور ایک دوجے پہ آنکھوں سے راز کھولتے ہیں
اگرچہ ہوتا ہے دونوں میں پیار تو سچّا
مگر ہمیشہ محبت میں جھوٹ بولتے ہیں

تمھارے سر سے یہ طرّۂ پُروقار اُترا تو بات ہوگی
شبِ سیہ کے نشے کا سارا خمار اُترا تو بات ہوگی
ابھی تو بیٹھے ہوئے ہو تُم ایک اونچی مسند کے شہ نشیں پر
بھنور سے بچ کر سفینۂ کبر پار اُترا تو بات ہوگی

ہائیکو

طلحہ غفور

تیرے جانے کے بعد سے جاناں
راستے سوگوار رہتے ہیں
اور پھر بے شمار رہتے ہیں

کھوکھلے پیڑ کے سہارے پر
جانے کیوں انحصار کرتا تھا
میں ترا اعتبار کرتا تھا

اک اُداسی بچی ہے دامن میں
وہ بھی اک دن تمہاری خوشیوں پر
ایک لمحے میں وار آئیں گے

وقت بدلا ہے کتنی تیزی سے
دل کی دھڑکن سے لکھنے والوں کو
کون ڈھونڈے گا اب کتابوں میں

ہمارے ظاہری حالات دیکھنے والے
تجھے خبر ہی نہیں ہے اداس لمحوں میں
ہماری آنکھ تسلسل سے بین کرتی ہے

''ریشمی خوابوں کی نیلی راکھ'' کی ایک سرسری کرید

کول اور نرول آرزوؤں کے ریگزار ہوتے مرغزاروں کا احساس ابھارتے مہناز کی نظموں کے مجموعے کا عنوان شاید شعری التباس تراشنے کی دُھن کا شاخسانہ ہے۔ یہ التباس اس نے مجموعے کے ابتدائیے میں بھی اپنی نظموں کو محبت کی شاعری کہہ کر پیدا کیا ہے۔ مگر پھر وہ خود ہی محبت کی حدوں کو خدا، انسان، فطرت اور کتاب تک پھیلا کر تہہ دار کر دیتی ہے۔ اور ہمارے دھیان کو اختر شیرانی کے کچے پکے جذبے جگاتی رومان پرور وادیوں کی طرف نکل جانے سے بچا لیتی ہے۔ اور پھر صفحہ در صفحہ ہم پر اپنے عہد سے جڑے فکر و احساس سے مالا مال ایک بالغ نظر شاعرہ کی ہمراہی میں چلنے کا تاثر گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ان نظموں میں خانگی رشتوں اور دھرتی کی خوشبو، تخلیقی عمل کی اسراریت، اکتشاف و دریافت کی حیرتیں جگاتی سرشاری، معمول کی زندگی سے آگے دل و دانش اور دنیائے حرف و صوت کی مشارکتیں، رسائیوں کی نشاط اور نارسائیوں کے حزن، صنفی امتیاز کے خلاف مزاحمت و احتجاج، خوشحالی کے سپنوں کی تکمیل میں وطنِ عزیز سے اہلیتوں کے انخلا کے دکھ اور روحانی و مابعد الطبیعیاتی لہروں کے لمس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ قاری کو روک روک لیتا ہے۔

ہماری تہذیبی گمبھیرتا کے حوالے سے یہ بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ دنیائے دانش کے عمومی چلن کے دباؤ میں اپنے روحانی سرچشموں کے ذکر سے گریز نہیں کرتی۔ وہ ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتی ہے کہ وہ اپنی تخلیقی انفرادیت کو خالقوں کے خالق کی بخشی ہوئی توفیق گردانتی ہے۔

جس کی گٹھڑی میں
ارض و سما کے سبھی
سانس لیتے ہوئے منطقے
ہیں بندھے ----
کون سی لہر جیسی ہوں
یہ سب خبر ہے اسے
کون سے رنگ سے
کون سے اسم سے
مجھ کو پہچان بخشے گا وہ

جلیل عالی

میں تو پہچان لیتی ہوں
اس کو
ملے چاہے جس رنگ میں
ابر کی شکل میں
دھوپ کے انگ میں
درد کے سنگ میں -----
ممتاز مفتی کہا کرتے تھے کہ عورت کے کچھ جذبات واحساسات ایسے ہوتے ہیں جنھیں عورت ہی اصل اور مکمل صورت میں پہچان اور بیان کر سکتی ہے۔ مہناز انجم بھی اپنی نظم ''تم ہو'' میں اسی نکتے کو اپنے اسلوب میں اجاگر کرتے ہوئے کہتی ہے۔

لکھو
اپنی مرضی کے
شبدوں کو دل کے ورق پر
تمھیں اپنے حصے کا کاغذ ملا ہے
پروں کو
کھلے آسمانوں کی باہوں میں کھولو
بہت پھڑ پھڑاؤ
یہ رفعت
تمہارے پروں کی دھمک سے
لرز کر سمٹ جائے گی
آٹھواں آسماں بھی تمہارے لیے ہے

تمہارا زمانہ
سمندر کے اس پار
آنکھیں بچھائے
یگوں سے
تمہارے لیے
منتظر ہے -----

یہ سب کچھ اپنی جگہ مگر اس سب کچھ کی پیش کش میں شاعرہ کے لَو دیتے ہوئے تخلیقی انفراد کے ذکر کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اس شعری جوہر کو فطرت اور اپنے مثالیے کی دوسراتھ میں تمو پاتے دیکھتی اور اپنے ہونے کا جواز جانتی ہے۔

فعولن فعولن
چھما چھم
زمانے اسی تال پر ناچتے ہیں
مری نظم کے پیر
اسی دھن کے ابلاغ پر
رقص کرتے ہوئے
کائناتی مسافت کو آواز دیتے ہیں
اور خون کے سرخ ریشم میں
اک خوش تمنا سی تھرکن
تمہاری مہک ڈھونڈتی ہے
کوئی کو
رو پہلی سی سطروں کو کاغذ پہ
زنجیر کرنے کا فن
ان بدلتے ہوئے موسموں نے سکھایا
(زمانے اسی تال پر ناچتے ہیں)

مجھے یقین ہے کہ وہ بتانے اور چھپانے کی جس جھلملاتے نظم تعمیرتی ہے یہ ہنر اس کی مستقبل کی شاعری میں اور بھی نکھرتا چلا جائے گا اور پڑھنے والوں کو مزید مسحور کرے گا۔

☆☆☆☆☆

دور سے آیا ہوا --- قصیٰ بن کلاب

چوتھی صدی عیسوی کے شروع ہوتے ہی دوسرے سال مکہ کی بستی میں آل اسماعیل کا ایک نامور آدمی کلاب بن مرہ فوت ہو گیا۔ ذہین، فطین آدمی تھا۔ اصل نام بھی اس کا حکیم تھا۔ مکہ کی بستی کے علاوہ وہاں ہر سال حج کے موقعے پہ عرب صحرا سے آنے والے دُور اور قریب کے لوگوں کو بھی اُسکا اچانک فوت ہو جانا اس لیے یاد رہا کہ اس نے ایک یادگار کام کیا تھا۔

یہ وہ شخص تھا جس نے عربی مہینوں کو سال بھر کے لیے بارہ نام دیے تھے، جواب تک رائج ہیں۔

اس شخص کے نام سے رائج رہ جانے والی حقیقتوں میں ان بارہ مہینوں سے کہیں بڑھ کے دو وہ نام نامی تھے جن سے ایک ایسا نام قائم ہونا تھا، جس کے لیے کائنات بنانے والے نے یہ ساری کھیڈ سجائی ہے۔

یہ دو نام اس کے دو بیٹوں کی اولادوں سے تیسری پشت پہ آنے والے تھے۔

اُس کے بڑے بیٹے زہرہ کے پوتے کی بیٹی ''سیّدہ آمنہ'' نے آنا تھا۔ جن کے نصیب میں خدا کے لاڈلے رسولؐ آخر کی والدہ ہونا لکھا تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے کے پوتے کے بیٹے کو ''عبداللہ'' ہونا تھا جنہیں رسولؐ آخر کے والد محترم ہونے کا شرف ملنے والا تھا۔

کلاب کا یہ اہم دوسرا بیٹا قصی تھا۔ قصی ابھی دو دو ہ پیتا شیر خوار بچہ تھا کہ اس کے والد کلاب بن مرہ فوت ہو گئے۔

اس کی ماں فاطمہ بنت سعد بیوہ ہو گئی۔

عرب معاشرے میں بیوہ کی دوسری شادی نہ اُس زمانے میں اچھنبے کی بات تھی نہ آج ہے۔ شیر خوار قصی کی والدہ فاطمہ نے دوسری شادی کر لی۔ جس سے شادی کی وہ عرب صحرا کے دور افتادہ شمال مغربی علاقے شام کے ایک سرحدی قبیلے عذرا کا سمجھدار آدمی ''ربیعہ بن حرام'' تھا۔ ممکن ہے تجارت کے سلسلے میں اس کا ادھر سے گزر ہوا ہو، یا وہ حج کے دنوں پہ مذہبی فریضہ ادا کرنے مکہ آیا ہو، بہر حال ربیعہ بن حرام نے فاطمہ سے شادی کر لی تو لامحالہ اپنی نئی بیوی کو اپنے قبیلے میں لے جانا پڑا۔

وہ چلی گئی۔

جاتے جاتے وہ اپنے چھوٹے شیر خوار بیٹے قصی کو بھی ساتھ لے گئی۔

ابدال بیلا

بڑا بیٹا زہرہ جوان تھا۔ قصی سے عمر میں سترہ اٹھارہ سال بڑا تھا۔ وہ اپنے ددھیال مکہ میں رہ گیا۔ قصی کا بچپنا اور اوائل جوانی شام کے سرحدی علاقے میں قبیلہ عذرا میں گزرے۔ جب جوان ہوا تو واپس اپنے اجداد کے علاقے مکہ میں آ گیا۔ مکہ میں رہنے والے اُس کے ددھیال اور ننھیال کے قرابت داروں نے اُسے محبت سے قصی کہنا شروع کر دیا ورنہ اُس کا اصل نام "زید" تھا۔ جب تک یہ پلٹ کے مکہ نہیں آیا اُسے کسی نے قصی نہیں کہا،

کیونکہ قصی کے معنی ہیں "دُور سے آیا ہوا"۔

یہ شاید دور سے نہ آتا اگر اس کے ساتھ، اس کے دور افتادہ سوتیلے باپ کے قبیلے عذرہ کے ہم عمر لڑکوں سے کشتی اور تیر اندازی کا مقابلہ نہ ہوتا۔ آل اسماعیلؑ کے گھرانے کے مردوں میں جہاں مردانہ وجاہت کے انبار لگے ہوتے وہیں شجاعت اور جی دار صفات بھی نظر آ جاتیں۔ خصوصاً اس قبیلے کے مردوں کو تیر اندازی کا چسکہ تھا۔ نشانہ بھی اچھا ہوتا۔ سوتیلے باپ کے قبیلے عذرا کے ہم عمر لڑکوں سے جب زید کھیل ہی کھیل میں نشانہ بازی کرتے سبقت لے گیا تو وہ اس سے لڑ پڑے۔

یہ بھی لڑا۔

کچھ گھونسے مارے کچھ کھائے۔

دل ہی دل میں افسردہ ہو گیا کہ یہ ایک وہ اتنے سارے۔

گھر آ کے ماں کو قصہ سنایا۔

اس کی ماں فاطمہ نے ممکن ہے زید کے لیے اس وقت پیار سے قصی کا لفظ استعمال کیا ہو کہ بیٹا تم تو دور دراز کے چشم و چراغ ہو۔ یہاں تیرے ہم عمر تمہارے جوڑ کے نہیں۔ تمہارا قبیلہ تو اس وادی کا سرخیل ہے۔ جہاں سارے عرب والے سال میں ایک بار اپنی، تھکی اونٹنیوں پہ چڑھ کے جاتے ہیں۔ وہاں پہ موجود خدا کے جس مقدس گھر کا سارے جہاں والے طواف کرتے ہیں، وہ تمہارے جد امجد ابراہیمؑ اور ان کے بیٹے اسماعیلؑ، نبیوں کے ہاتھوں کا بنا ہوا ہے۔

ماں نے شاید زید کو اس کے اجداد کے کچھ دل چسپ قصے سنائے یا مکہ کی وادی اور خدا کے گھر کا کچھ ایسا دل پذیر نقشہ باندھا کہ زید کا دل بے چین ہو گیا۔ دل میں ٹھان لی کہ مکہ کی وادی میں اپنے کنبے میں جا کے رہنا ہے، چاہے اس کے لیے اپنی ماں سے بچھڑنا پڑے۔ ماں نے بیٹے کی سفر کے لیے بے تابی دیکھی تو بولی، بیٹا کچھ دن ٹھہر جاؤ۔ تیرا علاقہ تو ایسا ہے جہاں اپنے ہی نہیں غیر بھی ہر سال جاتے ہیں۔ ابھی حج کا مہینہ قریب آنے دے دیکھنا کیسے لمبے لمبے قافلے اونٹوں پہ سوار اُدھر لبیک لبیک کہتے ہوئے جاتے ہیں۔ تم بھی ان مبارک دنوں میں، ایسے کسی خوش بخت قافلے کے ساتھ چلے جانا۔

ایسا ہی ہوا۔

قبیلہ قضاعہ کے کسی قافلے کے ساتھ سفر کرتا کرتا، زید مکہ پہنچ گیا۔ مکہ میں اس کا بڑا سگا بھائی زہرہ موجود تھا۔ زہرہ کی آنکھیں

خراب ہو گئیں تھیں مگر اپنے چھوٹے بھائی کو گلے لگاتے ہی وہ چیخ پڑا۔

میرا دُور افتادہ بسنے والا، میرا قصی آ گیا۔

خدا کی قسم میں اس آواز کو پہچانتا ہوں، اس شباہت کو جانتا ہوں۔ برس ہا برس سے تیرے انتظار میں تجھے سوچتا سوچتا اندھا ہو گیا ہوں۔ تو میرا یوسف ہے۔ زہرہ روتا جائے۔ بلبلاتا جائے۔ قصی سے چمٹا جائے۔ یہی زہرہ بنو زہرہ کا سربراہ بنا جس قبیلے سے سیّدنا آمنہ کی پیدائش ہوئی، رو رو کے کہتا جائے۔ تو آ گیا میرے بھائی اپنے قبیلے میں۔

قصی کیا آیا، آلِ اسماعیلؑ میں نیا حوصلہ آ گیا۔ خود خوبرو حسین اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔

ساتھ شام کی سرحد چھوڑ کے آئے اپنے سوتیلے باپ ربیعہ بن حرام کے قبیلے عذرا کی قوت بھی تھی۔ اس کی ماں فاطمہ کے بطن سے وہیں اس کے کئی بھائی بھی پیدا ہوئے تھے۔ خصوصاً ''رزاح'' نامی ماں جایا بھائی اس سے بہت پیار کرتا تھا۔ مکہ میں بھی اس کا قبیلہ معزز تھا۔ کہنے کو مکہ کی سرداری اور کعبہ کی چابیاں بنو خزاعہ کے پاس تھیں اور بنو خزاعہ کے ہی ایک رئیس عمرو بن لحی کے لائے ہوئے بت ہُبل کے بعد کعبے کے اندر اور صحن میں بتوں کی بہتات ہو گئی تھی۔ زم زم کے کنویں کو لوگ بھول چکے تھے، جسے بنو جرہم مکے سے بھاگتے بھاگتے بند کر کے ریت اور پتھروں بھرے کعبہ کے صحن میں غائب کر گئے تھے۔ اسی کنویں کے اندر انہوں نے کعبہ میں موجود چڑھاوے کا سامان، سونے کے بنے ہوئے دو ہرن، چھ نوادراتی تلواریں اور حجرِ اسود چھپایا ہوا تھا۔ زم زم کا کنواں بند تھا۔ مقدس آسمانی پتھر حجرِ اسود پردے میں پڑا تھا۔ شاید اس لیے کے خدا کے گھر میں انسان کے بنائے ہوئے انسان سے بھی حقیر بتوں کا راج تھا۔

قصی آ گیا۔

راج تو مکہ میں بنو خزاعہ کے ''حلیل'' نامی شخص کا ہی رہا مگر حلیل کی جواں سال بیٹی حُبّی کا دل دُور سے آئے حسین جواں، قصی سے تاراج ہو گیا۔ امکان ہے کہ حُبّی نے اپنے دل کی آرزو اپنے باپ سے کہی ہو گی، یا باپ نے خود پڑھ لی ہو گی۔ قصہ مختصر قصی کی شادی مکہ کی رئیس زادی حُبّی بنت حلیل سے ہو گئی۔ تھوڑے ہی دنوں میں قصی نے اپنی شخصیت کی چکاچوند سے اپنے سُسر حلیل خزاعی کا دل بھی جیت لیا۔ حلیل بھی دل میں جانتا تھا کہ جس خدا کے گھر کی چابیاں وہ اپنی جیب میں ڈالے پھرتا ہے اُسے بنانے والے قصی کے اجداد تھے۔ کعبہ کے متولی ہونے کا حق قصی سے زیادہ کس کا ہو سکتا تھا؟ کہتے ہیں حلیل خزاعی نے اپنی زندگی میں ہی اپنی جانشینی کے لیے اپنے بیٹوں کی بجائے اپنے داماد قصی کو چن لیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب حلیل خزاعی مرنے لگا تو اس نے کعبے کی چابی اپنے کسی بیٹے کی بجائے اپنی بیٹی حُبّی زوجہ قصی کو دے دی۔

حُبی کا چابی بردار المحترش تھا۔
کنیت اس کی ابوغبشان تھی۔
کہتے ہیں حُبی کہا کرتی تھی نہ میں کعبہ کا
دروازہ کھول سکتی ہوں نہ بند کر سکتی ہوں،
پھر چابی لے کر کیوں پھروں،
ابوغبشان جانے اور اُس کا کام۔
ابوغبشان کونسا غیر تھا۔
حُبی کا اپنا بیٹا تھا۔
قصی سے پہلے خاوند کا۔
قصی کا سوتیلا بیٹا۔
ایک دن قصی نے ابوغبشان کی ضیافت کی۔
سوتیلے بیٹے اور باپ میں بے تکلفی تھی۔
تھے بھی دونوں تجارت پیشہ۔
اِدھر اُدھر کے سودے کرتے کرتے قصی نے
کعبے کی تولیت کے حق کے لیے خدا کے گھر
کی چابی کا مول پوچھا۔ کلید بردار ابوغبشان
فنون لطیفہ کا بندہ تھا،
بولا ایک سارنگی اور ایک مشکیزہ شراب۔
قصی نے دونوں چیزیں اس کی گود میں
رکھیں اور کعبے کی چابی اُٹھالی۔ ابوغبشان کے
لیے گھاٹے کے اس سودے کے لیے عرب
میں آج تک ایک مثل مشہور ہے
اَخسرُ صَفْقَةٍ مِنْ اَبِیْ غُبْشَانَ
یعنی یہ سودا تو ابوغبشان کے سودے سے بھی
گھاٹے والا ہے۔
بہرحال سودا ہو گیا۔
قصی کعبہ کا کلیدار بردار بن گیا۔
حُبی بھی وہیں تھی۔ وہ تو پہلی ہی رئیس مکہ حلیل
خزاعی کے گھر تھی۔ اُسے اپنے گھر والے کو
رئیس مکہ دیکھنے سے کیا چیز مانع ہو سکتی
تھی۔ گھر میں مسئلہ تو طے ہو گیا مگر حُبی کے
قبیلے خزاعہ والوں کو یہ سودا پسند نہ آیا۔ وہ
برافروختہ ہو گئے۔ انہوں نے بزور شمشیر یہ
حق چھیننے کی تیاریاں شروع کر دیں۔
قصی تو پلا ہی تلوار سے کھیل کے تھا۔
آل اسماعیلؑ پیدائشی تیرانداز تھی۔
قصی نے اپنا قبیلہ جمع کرنا شروع کر دیا۔
لڑائی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔
قصی نے ایک گھڑ سوار دُور افتادہ اپنے
سوتیلے بھائی رزاح بن ربیع کی طرف شام
کی سرحد پہ دوڑایا۔ رزاح تین سو گھڑ سوار
لے کر مکہ پہنچ گیا۔ رزاح ساتھ اپنے سوتیلے
بھائیوں حسن، محمود اور پسران ربیعہ اور
قضاعہ کو بھی مدد کے لیے بلا لیا۔ اُدھر آل
اسماعیلؑ جو حالات زمانہ کی وجہ سے مکہ کے
اندر اور باہر صحرا میں بکھرے ہوئے تھے وہ
بھی اکٹھے ہو گئے۔ قصی نے اپنے اُوپر آٹھ
پشتوں کے اپنے اجداد کے لوگ نضر بن
کنانہ سے لے کر اپنے بھائی زہرہ کی اولاد
تک سارے صف آرا کر لیے۔
جنگ طے ہو گئی۔
جنگ میں تولیت کعبہ کی کھوئی ہوئی عزت
واپس لینا تھی، پشت در پشت سے بکھرے
ہوئے قبائل آل اسماعیلؑ مکہ میں یکجا ہو کے
قریشی قبائل کہلائے جانے تھے۔

☆☆☆☆☆

نصف دُنیا کا معذور فاتح: امیر تیمور

دُنیا کا یہ عظیم جنگجو سمرقند سے پچاس کوس جنوب کے قصبہ کیش (حال واقع ازبکستان) میں ۹ اپریل ۱۳۳۶ء کو ترک منگول قبیلہ برلاس کے سردار طراغائی بہادر کے ہاں اُس وقت پیدا ہُوا جب وہاں چنگیز خاں کے بیٹے چغتائی خاں کی چغتائی سلطنت زوال پذیر تھی اور ترکوں اور منگولوں میں اقتدار کی جنگ لگی ہُوئی تھی۔ ۱۳۴۷ میں قزغن نامی ایک مقامی نے چغتائی فرمانروا بیورولد سے اقتدار چھین لیا اور ۱۳۵۸ میں اپنے قتل تک حکمرانی کی۔ کہا جاتا ہے کہ قزغن خاں کو محمود غزان خان خلف ارغون نے امیر اور سپہ سالار مقرر کیا تھا۔ غزان خان (۵ نومبر ۱۲۷۱-۱۱ مئی ۱۳۰۴) ہلاکو خان کا پڑپوتا اور چنگیز خاں کی اولاد سے تھا جس نے منگول سلطنت کے ایک حصے پر ۱۴ اکتوبر ۱۲۹۵ سے لے کر اپنی وفات تک حکومت کی۔ طغرائی کا بھائی حاجی بیگ آتش مزاج اور شکی طبیعت کا آدمی تھا جس کی وجہ سے برلاس قبیلہ کے بہت سے امرا اور بہادر امیر قزغن کے دربار میں حاضر ہو گئے تھے۔ تیمور بھی اپنے والد کے مشورہ پر وہیں چلا گیا۔ ایک مرتبہ سرحد پار سے کچھ لٹیرے قزغن کے علاقہ سے گھوڑے بھگا کر لے گئے۔ قزغن نے گھوڑوں کی واپسی کا ذمہ تیمور کو سونپا۔ تیمور نے گھوڑوں سمیت جتنا سامان لوٹا گیا تھا سب امیر قزغن کے سامنے لا ڈھیر کیا۔ اس واقعہ کے بعد امیر قزغن تیمور کو پسند کرنے لگا اور اسی بنا پر اپنی پوتی اولجے ترکان آغا کی شادی ۵۷-۱۳۵۶ میں تیمور سے کر دی اور تیمور کو مینک باشی یعنی ایک ہزار سواروں کا سردار مقرر کیا۔ قزغن کے قتل کے بعد ایک منگول جنگجو تغلق تیمور نے مختلف سرداروں کی اقتدار کے لیے ناکام کوششوں کے دوران ۱۳۶۰ میں فتح یابی حاصل کی۔ اسی دوران ۱۳۵۹ میں تیمور کے والد کا بھی انتقال ہو گیا تو اُس کا چچا حاجی بیگ اور قبیلہ جلائر کے امیر بایزید سمرقند پہنچے اور سرداری کے دعویدار ہُوئے۔ حاجی بیگ نے طغرائی کی وفات کے بعد برلاس قبیلہ کے سربراہ کی حیثیت سے تغلق تیمور کی تابعداری قبول نہ کی تو نئے منگول حکمران نے تیمور کے اپنی طرف جھکاؤ اور اس کی بظاہر لچکدار طبیعت دیکھتے ہوئے حاجی بیگ کی جگہ اسے تومان باشی یعنی دس ہزار سواروں کے ساتھ سمرقند کا امیر مقرر

خاور اعجاز

کیا۔ اُدھر امیر تیمور دراصل پہلے ہی منگولوں کے خلاف سازش کر رہا تھا۔ اُس نے ۱۳۶۳ میں قزغن خان کے پوتے امیر حسین کے ساتھ اتحاد کر لیا اور تغلق تیمور کے تاتار ممالک پر مقرر کردہ بیٹے الیاس کھوجا کو شکست دی۔ ۱۳۷۰ میں ایلچائی کا انتقال ہو گیا جس نے تیمور کو اپنے سابق اتحادی امیر حسین کا بلخ میں محاصرہ کر کے قتل کرنے پر اکسایا اور یوں وہ ایک بڑے علاقہ کا تنہا امیر ہو گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق امیر حسین تاتاری امرا کے ہاتھوں قتل ہُوا۔

چنگیز کے خاندان سے تعلق کے سبب بلخ میں تخت نشینی کے بعد تیمور نے اُن تمام علاقوں پر قبضہ کی ٹھانی جن پر چنگیز خان کی اولاد حکمران رہی تھی۔ اِس مہم میں اُس نے ۳۷ برس صرف کیے اور بالترتیب چغتائی سلطنت کے علاقہ جات زیرِ تسلط لانے کے، کاشغر، خوارزم، خراسان، ہرات، نیشاپور، قندھار، سیستان، ماژندران، آذربائیجان اور گرجستان (جارجیا) سمیت ۲۷ ممالک پر فتح حاصل کی۔ ۱۳۹۱ میں روس کی مہم سے واپسی پر اگلے برس ایران پر لشکر کشی کی اور ہمدان، اصفہان اور شیراز فتح کر کے آلِ مظفر کی حکومت ختم کی نیز بغداد اور عراق سے احمد جلائر کو بے دخل کیا۔ ۱۳۹۵ میں توقتمش خان کو شکستِ فاش دی جسے تیمور نے سائبیریا کے آق اوردہ خاندان کے حکمران ارس خاں کے خلاف مدد پہنچا کر دوبارہ تخت دلوایا تھا مگر اُس نے تیمور کے مفتوحہ علاقہ خوارزم کو اپنی سلطنت کا حصہ سمجھ کر تیمور سے نہ صرف اس کی واپسی کا مطالبہ کیا بلکہ بار بار تیموری سلطنت پر حملہ آور بھی ہوا۔ ۱۳۹۸ میں تیمور ملتان اور دیپالپور سے ہوتا ہُوا دلی اور میرٹھ تک پہنچا اور قتل و غارت کا بازار گرم کیا۔ ۱۳۹۹ میں تبریز پہنچ کر سلطان مصر کے پاس سفیر بھیجے جنھیں قتل کر دیا گیا چنانچہ وہ سلطان مصر کی سرکوبی کے لیے حلب، حماہ، حمص اور بعلبک فتح کرتا ہُوا دمشق جا پہنچا اور قتلِ عام کے بعد شہر میں آگ لگا دی۔ پھر بغداد کا رُخ کیا جہاں احمد جلائر سلطانِ مصر اور عثمانی سلطان بایزید یلدرم کی ایما پر تیمور کے خلاف محاذ بنا رہا تھا لیکن وہ تیمور کی آمد سے قبل ہی فرار ہو گیا۔ اِس دوران سلطان بایزید یلدرم نے اپنے ہاں پناہ گزین احمد جلائر اور قرہ یوسف کی تحریک پر تیموری علاقوں پر حملہ کر دیا۔ تیمور نے خط و کتابت سے کام نکالنا چاہا لیکن ناکامی پر سلطنتِ عثمانیہ پر لشکر کشی کی۔ انقرہ کے نواح میں دونوں کا آمنا سامنا ہُوا جس میں بایزید شکست کھا کر گرفتار ہُوا۔

تیمور، چنگیز خاں کی نسبت بڑا جنگجو تھا کہ اُس کی فتوحات چنگیز خاں سے زیادہ ہیں۔ دُوسرے یہ کہ وہ ہر جنگ میں خود شریک رہا جبکہ چنگیز کی سلطنت کا بڑا حصہ اُس کے سپہ سالاروں کا فتح کردہ تھا۔ چنگیز خاں کی فوجی منصوبہ بندی بہت اچھی تھی جبکہ تیمور کی میدانِ جنگ میں فوجی حکمتِ عملی نہایت عمدہ تھی۔ تیمور کے مفتوحہ علاقوں کو مقامی حکمرانوں کے سپرد کرنے کے رویہ نے بہت سے علاقوں کو تیموری سلطنت کا مستقل حصہ نہ بننے دیا۔ اِس لحاظ سے چنگیز خاں کو اُس پر فوقیت حاصل ہے کہ اُس نے مفتوحہ علاقوں کو اپنے ہی زیرِ انتظام رکھا۔

تیمور بچپن سے ہی ذہین و فطین تھا لیکن طبیعتاً منتقم

مزاج تھا اور مخالفت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ استاد سے کبھی سرزنش نہ ہوئی کہ وہ اپنا سبق ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔ روایتوں میں آیا ہے کہ دس سال کی عمر میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ لڑائیوں میں زخم کھا کھا کر اُس کا دایاں ہاتھ شل اور دائیں پاؤں میں لنگ تھا۔ اسے یہ دونوں زخم سیستان کی ایک لڑائی میں تیر لگنے سے آئے تھے جنھیں تیمور نے کھینچ کر نکالا تھا مگر بعد میں یہ زخم بہت خراب ثابت ہوئے۔ وہ اگرچہ معذور ہو گیا تھا لیکن پھر بھی ایک ہاتھ سے تلوار اور دوسرے ہاتھ سے کلہاڑا بیک وقت چلا لیتا تھا۔ مسلمان ہونے کے باوجود اُس کی مہمات فقط شہرت اور ناموری کی خاطر اور اسلامی روح کے منافی تھیں لہٰذا اُسے نامور مسلمان فاتحین کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا کہ اُس نے ہزروں بے گناہوں کو محض انتقام کی خاطر موت کے گھاٹ اُتارا۔ اُس کی قفقاز میں لوگوں کو زبردستی مسلمان بنانے کی کوشش بھی اسلامی تعلیمات کے خلاف تھی۔ اگرچہ تیمور کو عالمِ اسلام کی بڑی طاقتوں کے خلاف لشکر کشی کا واحد ذمہ دار قرار نہیں دیا جا سکتا کہ تیمور جیسے بدلہ لینے والے شخص کو بالواسطہ یہ ترغیب دینے میں سلطنتِ عثمانیہ اور سلطان مصر کے ساتھ احمد جلائر جیسے لوگ بھی شامل تھے تاہم اُس کی اِن مہمات نے اسلامی مملکتوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچایا اور دونوں طرف سے ایک دُوسرے کی برتری کو تسلیم نہ کرنے کی روش اِس کا سبب بنی۔ مار دھاڑ سے بھرپور زندگی کے ساتھ اُس نے مفتوحہ علاقوں سے صناعوں، دستکاروں، فنکاروں، عالموں اور ادیبوں کو سمرقند میں جمع کر کے شہر کو شاندار عمارتوں اور علم و ادب کا مرکز بنانے میں بھی کردار ادا کیا اور اُس کی اِسی ایک خوبی نے آگے چل کر اُس کی اولادوں، خصوصاً مغل بادشاہوں میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا جنھوں نے برِصغیر میں علم و ادب کی ایسی شمعیں جلائیں جو آج تک روشن ہیں۔ وہ خود بھی چغتائی، فارسی اور وسطی منگولیائی زبانیں جانتا تھا۔ اُس نے اپنی یادداشتیں بھی مرتب کی تھیں جسے اُس کی آپ بیتی کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ مثنوی پڑھنے کے بعد تمام مذاہب کو احترام دینے کی روش کے سبب وہ مولانا روم سے متنفر ہو گیا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اسلام تمام مذاہب سے برتر اور اعلیٰ ہے۔ شیراز فتح کرنے کے بعد حافظ شیرازی کو طلب کر کے پوچھا کہ کیا یہ شعر تمھارا ہے:

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دلِ ما را
بخالِ ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

شاعر کے اثبات پر تیمور بولا کہ "حد ہو گئی فیاضی کی، مَیں نے ہزاروں جانوں کی قربانی دے کر سمرقند و بخارا کو فتح کیا اور تم محبوب کے ایک تل پر نچھاور کیے جاتے ہو؟" حافظ شیرازی نے اپنی شیروانی کے بٹن کھول کے پھٹی ہُوئی قمیض کی جانب اشارہ کرتے ہُوئے کہا کہ "ہماری اِسی بخشش اور دریادلی نے تو ہمیں یہ دن دکھائے ہیں" حافظ کی حاضر جوابی پر تیمور نے اُنھیں ایک ہزار سونے کے سکے مرحمت کیے۔ دمشق اور حلب کے علما کے ساتھ تیمور کے مکالمے علما و فضلا کی قدردانی کی مثال ہیں۔ تیمور نے ۱۹ فروری ۱۴۰۵ کو فاراب میں وفات پائی اور سمرقند میں مدفون ہُوا۔

☆☆☆☆☆

سرقہ یا توارد---یا کچھ اور---؟

[محترم ظفر اقبال صاحب کے "دال دلیا" کے تناظر میں]

عہدِ موجود کے بابائے غزل جناب ظفر اقبال صاحب کا ایک کالم (کہ بالخصوص عہدِ رواں میں شعر و ادب کی دنیا میں زندہ رہنے کے لیے کالم لکھنا بہت ضروری ہے) اچانک فیس بک کی ایک پوسٹ میں نظر آیا۔ تاریخ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ یہ ۲۰۱۸ء کے ماہ ستمبر میں لکھا گیا تھا، افسوس کہ چھ سال بعد نظر سے گزرا۔ پہلے تو اتنی تاخیر کے باعث نظر انداز کر دیا گیا، پھر خیال آیا کہ موضوع ایسا ہے کہ اس پر بات ہونی چاہیے کہ جس شعر کے حوالے سے کالم لکھا گیا ہے ہمارے بعض دوست اب بھی اس موضوع پر بات کرتے نظر آتے ہیں۔ "دال دلیا" کے مستقل سلسلے کے کالم میں "کاک ٹیل" کے عنوان سے محترم ظفر اقبال صاحب نے فارسی کے ایک قدیم شاعر قمی شہیدی کے حوالے سے ایک شعر نقل کر کے نہایت عمدہ غزل گو اور توانا فکر شاعر جناب عباس تابش کا مشہور زمانہ شعر درج کیا ہے اور ملاحت آمیز طنزیہ پیرایے میں لکھا ہے کہ:

"یہ فارسی شعر کا چربہ تو نہیں ہو سکتا کیوں کہ عباس تابش بھی میری طرح فارسی زبان سے تقریباً نابلد ہیں۔"

اس لفظ "چربہ"، "میری طرح" اور "نابلد" کا بھی جواب نہیں۔ میرے خیال میں، اس عہد میں ظفر اقبال صاحب سے زیادہ فارسی کون جانتا ہے۔ اُن کے بارے میں گمان غالب ہے کہ وہ اچھی خاصی فارسی جانتے ہیں، اور صرف جانتے ہی نہیں بلکہ فارسی گوئی پر انھیں عبور حاصل ہے اور یہ گمان یوں ہی نہیں کہ "آبِ رواں" سے لے کر عہدِ رواں تک ان کی شاعری میں اس کا پرتو دکھائی دیتا ہے، مزید یہ کہ (شنید ہے

خالد علیم

اور ــــ ''شنیدہ کے بود مانندِ دیدہ'') وہ گلہ گزار بھی رہتے ہیں کہ عصرِ جدید کے نوجوان شعرا میں جو زبان و بیان کی غلطیاں در آتی ہیں، ان کے فارسی نہ جاننے کی وجہ سے ہیں۔ خاص طور پر تراکیب کی شتر گربگی اور تلفظات کی غلطیاں وغیرہ۔ سو ایسے نوجوان شعرا نے بھی اس کا آسان حل یہ نکال لیا ہے کہ انھوں نے مرکباتِ شعری ہی کو ترک کر دیا ہے اور آسان اردو میں پیچیدہ ''شعری جمالیات'' کا راستہ دریافت کر لیا ہے۔ تلفظ کے مسئلے پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں، جس نے جو کہہ دیا، وہی روز مرّہ ہو گیا، اور ہر ایک کو یہ دعویٰ ہے کہ:

''مشہور جہاں ہے روز مرّہ میرا''۔

جہاں تک ''قمی شہیدی'' کا تعلق ہے، میں اپنی کم علمی کے باعث ناشناسا ہوں، میں نے مختلف ذرائع سے قمی شہیدی کے نام و کلام کو تلاش کرنا چاہا۔ مولانا شبلی نعمانی کی ''شعر العجم''، پروفیسر ایڈورڈ براؤن کی ''تاریخِ ادبیاتِ ایران''، رضا زادہ شفق کی ''تاریخ ادبیات ایران''، دولت شاہ سمرقندی کا ''تذکرۂ دولت شاہ''، مولانا محمد حسین آزاد کی ''نگارستانِ فارس''، ڈاکٹر محمد ریاض کی ''فارسی ادب کی مختصر تاریخ'' اور دو تین دوسرے تذکرے، یہاں تک کہ شیخ محمد اکرام کا ''ارمغانِ پاک'' اور ڈاکٹر ظہور الدین احمد کا تذکرہ ''پاکستان میں فارسی ادب'' وغیرہ بھی دیکھے مگر ناکامی ہوئی کہ اس قلیل وقت میں مجھ نارسا کی پرواز ان میسرات کی حدود سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ شعر کس ''خزانۂ عامرہ'' میں مدفون ہے، اگر فارسی دان حضرات اس نام کے شاعر اور اس شعر پر روشنی ڈال سکیں تو میں اُن کا ممنونِ خاص ہوں گا۔ اور اہم ترین یہ کہ اگر خود ظفر اقبال صاحب اس شاعر کا زمانہ ظہور اور شعر کا حوالہ درج فرمادیں تو سارا قضیہ ختم ــــ

بالاتفاق فارسی کے ایک معروف شاعر ملّا ملک قمی (وفات: ۱۰۲۴ھ) کو بھی اگر شہید قرار دے دیا جائے تو خلافِ حقیقت نہ ہوگا کہ اُس کی وفات بھی دکن میں دورانِ سفر دو گروہی تصادم کے نتیجے میں ہوئی تھی، یعنی انھیں قتل کر دیا گیا تھا لیکن ''شہیدی'' ان کے نام کا حصہ نہیں تھا، البتہ میں شہیدی تخلص کے ایک اردو شاعر کرامت علی شہیدی (متوفی ۱۲۵۵ ہجری) کو ان کے ''دیوانِ شہیدی'' اور نعتیہ شاعری میں مشہور قصیدۂ نعت کی بنا پر ضرور آشنا ہوں جس کا یہ شعر تو اُن کے ایمان افروز خواب کی تعبیر بن گیا:

تمنا ہے، درختوں پر ترے روضے کے جا بیٹھے
قفس جس وقت ٹوٹے طائرِ روحِ مقیّد کا

....

کہ زیارتِ مدینہ کے دوران اُن کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی۔ سبحان اللہ!
"یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے"
ملک قمی وہی مشہور فارسی گو شاعر تھے جن کے درجِ ذیل شعر پر علامہ اقبال کی ایک تضمین "بانگِ درا" میں موجود ہے:
رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

.....

یعنی چلتے ہوئے میں نے اپنے پاؤں سے کانٹا نکالا تو محمل میری نظر سے اوجھل ہو گیا (گویا) ایک لمحے کی غفلت سے سو سال کی راہ مجھ سے دُور ہو گئی۔
اس شعر کے قریب قریب اصغر گونڈوی کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو:
قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

.....

تو اسے بھی کسی اعتبار سے سرقہ سمجھیے، استفادہ سمجھیے یا توارد، آپ کی مرضی! لیکن میرے نزدیک اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے نہ تو یہ سرقہ ہے، نہ توارد۔ اصغر گونڈوی کے ہاں آنکھ کے جھپکنے سے محمل کا نظر سے اوجھل ہو جانے کا پہلو اگرچہ غفلت ہی کا پہلو ہے جو ملک قمی کے شعر میں بھی بیان ہوا مگر یہ غفلت طریقِ عشق میں روا نہیں کہ یہاں آنکھ جھپکنے کی مہلت بھی میسر نہیں جب کہ ملک قمی کے شعر میں "غفلت" کا پہلو فکری لحاظ سے اس اجتماعی المیے کو اجاگر کرتا ہے جس سے قومیں اِدبار و تنزل سے دوچار ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے فکری مقصد کے پیشِ نظر اس شعر کو تضمین کیا۔
قمی شہیدی کے نام سے جو شعر ظفر اقبال صاحب نے درج کیا ہے، یہ ہے:
شبے گفتم مرا از تیرگی ہا ہول می آید
ازاں شب دیدۂ مادر، شدہ از خواب محرومی

.....

قمی شہیدی کی تلاش کے مرحلے میں ہم ہرگز یہ ادّعا نہیں رکھتے کہ یہ شعر اردو شعر کی فارسی صورت گری ہے، جب کہ:
بیاں کچھ اور کہتا ہے، زباں کچھ اور کہتی ہے
اس شعر کا اردو میں مفہوم یوں بنتا ہے:
ایک رات میں نے کہا کہ مجھے اندھیروں سے خوف آتا ہے --- اُس رات سے (آج تک) میری ماں کی آنکھیں نیند سے محروم ہو چکی ہیں۔
اب جناب عباس تابش کا شعر، جو انھوں نے درج کیا، اور شہرت کے اعتبار سے بھی بقائے دوام کا درجہ رکھتا ہے، یہ ہے:
ایک مدت سے مری ماں نہیں سوئی تابش
میں نے اک بار کہا تھا، مجھے ڈر لگتا ہے

.....

جہاں تک چربے یا سرقے کا تعلق ہے، معاملہ عباس تابش کے شعر سے بالکل مختلف ہے۔ سرقے کے حوالے سے فرد جرم عاید کرنے سے پہلے دیکھنا پڑے گا کہ سرقے کی نوعیت کیا ہے اور اس جرم کو کن امور کے ساتھ پرکھا جاسکتا ہے۔ سرقے کی تعریف میں سیّد خالد جامعی لکھتے ہیں:

"سرقہ، تصرف، افادہ، استفادہ، استفاضہ، اخذ، تقلید، نقل، توارد، یکسانیت، مشابہت، مطابقت، متحد الخیالی، متوازیات (Parallelism) اثر اور امثال سرقہ (نثر و نظم) سے متعلق مباحث علمی و ادبی تواریخ کے خصوصی موضوع رہے ہیں۔"

(سلمان چشتی، ریحان چشتی، سیّد خالد جامعی: چہ دلاور است دُزدے، کراچی، شعبہ تصنیف و تالیفِ ترجمہ، جامعہ کراچی، ۲۰۰۷ء، ص ا)

اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ سب نوعیتیں سرقے کی مکمل تعریف کی ذیل میں نہیں لائی جاسکتیں۔ بالخصوص:

"جن کا قلم یہ فرد قرارداد ہمارے بہترین شعرا کے خلاف مرتب کرتا ہے، وہ حضرات علمِ نفسیات اور تاریخ سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جب تہذیب اور کلچر ایک ہو، شاعری کا میدان اپنی تنگی یا وسعت میں ایک سا ہو، جب تحسینِ کلام کا معیار اور طرزِ ادا نہ صرف یکساں بلکہ ایک دوسرے سے ماخوذ ہو اور ان مسلمہ عوارض میں شاعری کی بنیاد محض تخیل ہو تو تخیل اور مضامین میں مساوات کا ہونا لابد ہے۔ اب اسے چاہے کوئی سرقہ کہے یا تصرف کہے یا توارد۔"

(چہ دلاور است دُزدے، ص ۳، بہ حوالہ پنڈت برجموہن دتاریہ کیفی)

ڈاکٹر عندلیب شادانی نے "تحقیق کی روشنی میں" اپنے ایک مضمون "سرقہ اور توارد" میں بہت سے ایسے فارسی گو شعرا کے فارسی شعر اور ان کی ذیل میں اردو شعرا کے شعر درج کیے ہیں جو کہیں سرقہ اور کہیں توارد کی ذیل میں آتے ہیں۔ ذکر قتی شہیدی کا ہے تو ملک قمی (شہیدی) ہی کے حوالے سے اصغر گونڈوی کا یہ سرقہ ہے یا توارد؟ بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے (یاد رہے کہ یہ شعر ملک قمی کا ہے، قتی شہیدی کا نہیں):

خواب دیدم کہ ترا دست بدامن زدہ ام
در گریبان خودم بود چو بیدار شدم
(ملک قمی)

(میں نے خواب میں دیکھا، تیرا دامن میرے ہاتھ میں ہے مگر جب میں جاگا تو دیکھا کہ اپنا ہی گریبان پکڑے ہوئے ہوں)

اب اصغر گونڈوی کا شعر ملاحظہ ہو:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا
جب آنکھ کھلی، دیکھا، اپنا ہی گریباں ہے

.....

بہ حوالہ "تحقیق کی روشنی میں"، ذرا یہ مثال بھی دیکھتے چلیں:

ز شوق سیر گلزار آں قدر فرصت نمی یابم
کہ در پائے گلے بنشینم و خارے بروں آرم
(ملک قمی)

(سیر گلزار کا شوق اتنی مہلت نہیں دیتا کہ کسی گلاب کے نیچے بیٹھ کر کانٹا نکالوں)

اور مظفر خاں گرم کے اس شعر کے تناظر میں:

فرصت کہاں ہے اتنی جنوں میں کہ بیٹھ کر
تلووں سے اپنے خار مغیلاں نکالیے

.....

نمایاں فرق صرف شوق سیر گلزار" اور جنوں" کا ہے جس کے باعث پاؤں سے کانٹا نکالنے کی مہلت بھی میسر نہیں، تاہم ڈاکٹر عندلیب شادانی لکھتے ہیں کہ:

"مظفر خاں گرم رام پوری حکیم مومن خاں کے شاگرد تھے۔ ان کے پوتے فدا علی خاں صاحب مرحوم پروفیسر ڈھاکا یونیورسٹی نے یہ دونوں شعر راقم الحروف کو سنائے تھے اور فرمایا تھا کہ: "دادا جان کہتے تھے کہ دیکھو تو اردو سے کہتے ہیں۔ یہ شعر کہے مدتیں گزر چکی تھیں کہ ملک قمی کا شعر نظر سے گزرا۔"

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ملک قمی کے شعر کے مقابل مظفر خاں گرم رام پوری کا اردو شعر تاثیر کے لحاظ سے تغزل کی اعلیٰ روایت کا حامل ہے۔

میرے خیال میں کچھ یہی صورت عباس تابش کے شعر کی بنتی ہے کہ میرے علم کی حد تک قمی شہیدی نام کا کوئی بھی شاعر فارسی کے شعری ادب میں کہیں دکھائی نہیں دیتا جب کہ محترم ظفر اقبال نے عباس تابش کے شعر کے ساتھ یہ نوٹ لگاتے ہوئے کہ ---:

"یہ فارسی شعر کا چربہ تو نہیں ہو سکتا کیوں کہ عباس تابش بھی میری طرح فارسی زبان سے تقریباً نابلد ہیں۔" اور --- "خوشی ہوئی کہ فارسی زبان کے شعرا بھی ہمارے اردو شعرا سے استفادہ کرنے لگے ہیں۔" (دال دلیا)

دونوں جملوں کے بین السطور میں جہاں عباس تابش کے شعر کو چربہ قرار دینے کی کوشش نظر آتی ہے وہیں فارسی گو شعرا پر بھی دل چسپ فرد جرم عاید کر دی گئی ہے۔ اگر چربے سے ان کا مقصود صرف "استفادہ" ہے، جیسا کہ متذکرہ اقتباس کے ثانی الذکر جملے

سے عیاں ہوتا ہے تو پھر یہ بھی سوچنا پڑے گا کہ اُن کے دریافت کردہ قمی شہیدی کا زمانہ ظہور یا تو عباس تابش کی ہم عصریت کا ہے یا قدرے بعد کا۔۔۔ اور اس کے بارے میں: ''معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد''۔۔ اسے طنزِ ملیح کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر، اور ''خطائے بزرگاں گرفتن خطاست'' کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے کہ آداب بزرگاں کا تقاضا بھی یہی ہے، محترم ظفر اقبال کے بارے میں کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک مضمون میں عرض کیا تھا کہ وہ ادھر اُدھر کی باتوں سے کالم کا پیٹ بھرتے ہوئے کوئی نہ کوئی شوشہ ایسا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ان کا ذکرِ خیر پردۂ ادب پر ظہور فرما رہے۔ اس میں ان کے ہاں کسی مثبت و منفی ردِ عمل کو دخل نہیں۔

محترم ظفر اقبال صاحب نے سرقہ کے بجائے لفظ ''چربہ'' پر زور دیا ہے جب کہ سرقے کے موضوع پر مختلف اہلِ فن نے اظہار خیال کر رکھا ہے مگر اس حوالے سے کوئی کتاب موجود نہیں جو اس موضوع کا مدلل احاطہ کرتی ہو۔ مولوی نجم الغنی رامپوری کی ''بحر الفصاحت'' میں اس حوالے سے کچھ مباحث موجود ہیں۔ اس طرح یگانہ چنگیزی نے ''غالب شکن'' میں بھی کسی حد تک سرقے کی نوعیت کو اجاگر کیا ہے، پنڈت دتاتریہ کیفی، ناطق لکھنوی اور خاص طور پر ڈاکٹر عندلیب شادانی نے ''تحقیق کی روشنی میں'' اور ''دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی'' میں قدرے تفصیل سے علمی و تنقیدی مباحث کا احاطہ کرتے ہوئے سرقے اور توارد کی مثالیں پیش کی ہیں مگر اس موضوع پر حتمی نتائج و تعینات کے ساتھ کوئی علمی و ادبی کام نظر نہیں آتا۔

تاہم ان مباحث کے ضمن میں محترم ظفر اقبال کے پیش کردہ شعر اور شعر کے خالق کا وجود تا حال پا در ہوا ہے کہ اس شعر کے مفروضہ فارسی شاعر قمی شہیدی کا وجود محترم ظفر اقبال کے سوا کسی اور کو ہمت نہیں کہ ثابت کر سکے، ورنہ دوسری صورت میں یہ سوال کہ عباس تابش کا متذکرہ شعر چربہ ہے؟ سرقہ ہے یا توارد؟ ان مباحث میں اہلِ زبان و ادب بالخصوص اہلِ فن کو ''اختراع'' پر بھی تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ یعنی بالخصوص سرقہ ثابت کرنے کے لیے فارسی کے وہ اشعار جو کسی بھی جینوئن اردو شاعر کے شعروں کے مضامین کو سامنے رکھ کر گھڑ لیے گئے ہوں۔ یہ کام اردو کے دو بڑے شاعروں میر تقی میر کے ضمن میں بھی ہو سکتا ہے اور غالب کے ضمن میں بھی، جیسا کہ غالب کے اس شعر کو بیدل کا سرقہ یا چربہ قرار دیا جاتا رہا ہے:

بوے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

.....

اور درج ذیل شعر "کلیاتِ بیدل" میں ڈھونڈتے رہیے اور---- "چربہ چربہ" یا "سرقہ سرقہ" پکارتے رہیے!

"بوے گل، نالۂ دل، دُودِ چراغِ محفل
ہر کہ از بزمِ تو برخاست، پریشاں برخاست

.....

گویا مصرعہ اولیٰ اپنے مکمل لفظی دروبست کے ساتھ بیدل کا اور مصرعۂ ثانی بیدل کا ترجمہ، گویا غالب کے مصرعۂ ثانی کی نشست و برخاست بڑی آسانی سے فارسی میں منتقل ہوگئی۔ یوں اس شعر کے حوالے سے غالب پر سرقے کا الزام سبک ہندی کے معروف و ممتاز شاعر کے حوالے سے ہے جب کہ محترم ظفر اقبال نے کئی قدم آگے بڑھ کر پورے کا پورا شاعر ہی تخلیق فرما دیا۔ تاہم خطا معاف - - - بڑوں کی باتیں بھی بڑی--- اگر محترم ظفر اقبال صاحب کی دریافت "قمی شہیدی" اور "اردو شعرا سے استفادہ" کو طنزِ ملیح کے بجائے طنزِ صحیح مان لیا جائے تو غالب بے چارے نے کیا قصور کیا تھا جو اُن پر سرقے کا الزام لگا دیا گیا۔ اسی لیے انھوں نے کہہ رکھا ہے:

ز رفتگاں بہ یکے گر تواردم روداد
مداں کہ خوبیِ آرایشِ غزل بردہ است
(اگر اگلے لوگوں میں سے کسی کے ساتھ مجھے توارد ہو گیا تو یہ نہ سمجھو کہ اس سے غزل کے حسن کو داغ لگ گیا)

.....

مراست ننگ و لے فخرِ اوست کاں بہ سخن
بہ سعیِ فکر رسا جا بداں محل بردہ است
(یہ بات میرے لیے باعثِ ننگ ہے لیکن اس کے لیے باعثِ فخر ہے کہ وہ اپنی فکرِ رسا کی کوشش سے اس مقام تک پہنچ گیا، جہاں میری رسائی ہوئی ہے)

.....

مبر گمانِ توارد یقین شناس کہ دُزد
متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بردہ است
(توارد کا گمان بھی نہ کرو بلکہ یقین جانو کہ چور میرا مال خزانۂ ازل سے چرا لے گیا)

.....

ہزار چاہا کہ محترم ظفر اقبال کی حمایت میں عباس تابش کے متذکرہ شعر کو کھینچ تان کر میں بھی چربے کی ذیل میں لے آؤں مگر جہاں اختراعِ شعر بلکہ اختراعِ شاعر کا گماں گزرتا ہے، اس گمان کی بنیادی وجہ وہی ہے جو میں اوپر بیان کر چکا ہوں، تو پھر "کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا!"

پھر محترم ظفر اقبال کا اس سلسلے کا ایک مزید

کالم "کچھ اعترافات، کچھ اطلاعات" ۲۴ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو سامنے آیا جس میں انھوں نے مذکورہ فارسی شعر کے خالق کا نام قمی شہیدی کے بجائے قمی بازکانی بتایا اور بھول گئے کہ اپنے گزشتہ کالم میں انھوں نے شعر کے خالق کا نام کیا بتایا تھا۔ پھر کسی حوالے کے بغیر لکھا کہ شعر ان کے دیوان ہی میں کہیں ہوگا۔ اب یہ "کہیں ہوگا" سے کیا مراد ہے اور کیا سند کے لیے اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوگا، یہ تو وہی جانتے ہیں مگر سند کے لیے یہ قیاس ناکافی ہے جب کہ پہلے کالم میں انھوں نے قیاس کے بجائے پورے تیقن کے ساتھ مدّعا ے اظہار فرمایا تھا جو آخرِکار دوسرے کالم میں "دیوان ہی میں کہیں ہوگا" کے قیاس پر منتج ہوا۔ تاہم اگر ان کا مقصد قمی شہیدی اور پھر قمی بازکانی کے ناموں سے ملک قمی تصور کر لیا جائے تو انھیں بخوبی علم ہوگا کہ ملک قمی ایک معروف شاعر کے طور پر، بلکہ دکن میں ابراہیم عادل شاہ کے ملک الشعرا کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے بعض اشعار سے اگرچہ اصغر گونڈوی اور مظفر خاں گرم کے شعری توارد ات کا ذکر سابقہ سطور میں کیا جا چکا ہے، انھیں توارد سمجھیں یا سرقہ، اس سے قطعِ نظر ملک قمی کا سارا دیوان چھان پھٹک کر دیکھ لیا، محترم ظفر اقبال کا بیان کردہ شعر کہیں نہیں ملا۔ "خواب" کو قافیہ تصور کرتے ہوئے "محرومی" نام کی کوئی ردیف پورے دیوان میں موجود نہیں، اور اگر مصرعۂ ثانی کو مصرعۂ اولیٰ بنا کر شعر کی قرات یوں کی جائے:

ازاں شب دیدۂ مادر، شدہ از خواب محرومی
شبے گفتم مرا از تیرگی ہا ہول می آید

.....

تو اس صورت میں بھی "می آید" کی ردیف کے ساتھ "دیوانِ قمی" میں جو غزلیں ملتی ہیں، مثلاً: "(۱) گل افشانِ سرِ زلفش ز گیرودار می آید، (۲) گرہ بر ابرو و چین بر جبیں افگندہ می آید، (۳) چراغ دودمانِ احمدِ مختاری آید، (۴) بہ بندِ غم فغانی از دلِ ناشادی آید، وغیرہ، مذکورہ شعر کا نام ونشاں تک نہیں ملتا۔ سو، نتیجہ؟ ناکامی کے سوا کیا ہو سکتا ہے!--- اور اسی ناکامی سے میں خود بھی دوچار ہوں۔ بہتر ہے کہ ظفر اقبال صاحب ہی مکمل حوالوں کے ساتھ اس "خزانۂ عامرہ" کی نشان دہی فرما دیں جس کی (تاحال مفروضہ) بنیاد پر عباس تابش کے متذکرہ شعر کو چربہ قرار دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ دوسری صورت میں یہ عندیہ بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ: ---"خطاے بزرگاں گرفتن خطاست"

مگر یہ خطا اور بار بار--- چہ معنی دارد؟

☆☆☆☆☆

''کربِ کشمیر''.....ایک کرب زدہ کشمیری شاعر کے نوحے

آزاد کشمیر کے ضلع حویلی سے تعلق رکھنے والے شاعر محترم حاجی سید رضوان حیدر رضوان سے میری جب بھی ملاقات ہوتی ہے مجھے وادی کشمیر کا کرب اُن کے چہرے پر جلی حروف میں تحریر نظر آتا ہے، کہ اُن کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی کے اندر سے بھی اُن کا وہ کرب کروٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے جو کشمیر کی جبر و بربریت میں گھری وادی کا باشندہ ہونے کے باعث اُن کی روح کو بھی کچوکے لگا رہا ہے۔

اب جو اُن کا پانچواں اور تازہ ترین شعری مجموعہ ''کربِ کشمیر'' کے عنوان سے آواز پبلی کیشنز راولپنڈی کے تحت شائع ہو کر نظر نواز ہوا تو محسوس ہوا کہ حاجی سیّد رضوان حیدر رضوان نے یہ الفاظ اپنے قلم سے نہیں،، آنسوؤں سے تحریر کیے ہیں، اور یہ چاہے غزل و نظم کی شعری ہیئتوں میں ہی لکھے گئے ہوں انہیں نوحے ہی کہنا چاہیے۔ یہ نوحے کسی ایک فرد کے نہیں، اکیلے حاجی رضوان حیدر کے نہیں، بلکہ ہر اُس کشمیری کے ہیں جو آزاد کشمیر میں ہو، مقبوضہ کشمیر میں ہو یا دُنیا کے کسی بھی ملک یا خطے میں ہو، اس کے اپنی دھرتی پر ہونے والے ظلم و ستم پر بلند ہونے والے نوحے ہیں، یہ پوری وادیِ کشمیر کے نوحے ہیں جنھیں سماعت کرنے کی اہلیت سے دنیا بھر کے ممالک، عالمی تنظیمیں اور عالمی ضمیر محروم ہیں، اور جو کئی دہائیوں سے کشمیر میں جاری لاقانونیت، جبر و ظلم، بربریت اور بنیادی انسانی حقوق کی پامالی دیکھ کر بھی بے حسی کے درجۂ کمال کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

کشمیر کے ایک بیٹے کی حیثیت سے اُن کا قلم مقبوضہ کشمیر کے علاوہ آزاد کشمیر کی مخدوش سیاسی و معاشی صورت حال اور کشمیریوں سے صاحبانِ اقتدار کے استحصال اور حکومتی جبر پر بھی صدائے احتجاج بلند کرنے میں ''خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سُن لے'' پر عمل پیرا ہے۔ افسوس صد افسوس کہ خود حکومتِ پاکستان بھی گذشتہ پون صدی میں کشمیر کے بارے میں کوئی مضبوط آواز اور کشمیری عوام کی آزادی کے لیے کوئی عملی قدم نہ اُٹھا سکی، اور سوائے

نسیمِ سحر

لفظی وعدوں یا دعووں کے وہ بھی اور سرکاری
سطح پر قائم کردہ "کشمیر کمیٹی" بھی بے عملی کا
ایک نمونہ بن کر رہ گئیں۔ یہ سارا کرب کشمیر کے
ایک دردمند بیٹے حاجی سیّد رضوان حیدر رضوان کی
نظموں اور غزلوں میں چھلک اور جھلک رہا ہے۔
ہر کشمیری کی طرح وہ پاکستان کو بڑا بھائی اور خود کو
اس کا چھوٹا بھائی کہتے ہوئے اپنی انتہائی جذباتی
اور سچی نظم "مانگتا بھائی ہے ہم سے اب اور کیا"
میں یوں گلہ مند ہیں:

ظلم سہتے رہے ، مار کھاتے رہے
تیری خاطر سروں کو کٹاتے رہے

تیرے پرچم میں لاشیں دباتے رہے
نعرے اِلحاق کے ہم لگاتے رہے

تجھ سے کب کی شکایت ، یا شکوہ گلہ؟
"مانگتا بھائی ہے ہم سے اب اور کیا"

تُو ہے رَب کی عطا تُو مری شان ہے
میرے مولا کا یہ مجھ پہ احسان ہے

بھائی ہونے پہ اب بھی مجھے مان ہے
"چاند تارے" میں رضوان کی جان ہے

سر نِگوں تیرا پرچم نہ ہونے دیا!
"مانگتا بھائی ہے ہم سے اب اور کیا"

.....

حاجی رضوان حیدر رضوان ایک حساس
شاعر کے طور پر محض کشمیر کا کرب ہی محسوس
نہیں کرتے بلکہ اپنی مظلومیت کی کیفیات
انہیں دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی
مسلمانوں پر کیے گئے مظالم اور ناانصافیوں
پر صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور کرتی
ہیں، اور یوں ان کا کرب کشمیر کی سرحدوں
سے باہر تک پھیل کر اُن کی شاعری کو
مقامیت کے درجے سے آفاقیت کے
درجے تک بلند کر دیتا ہے۔ برما کے
مسلمانوں پر وہاں کی بدھ مت کے
پیروکاروں کی نمائشی امن پسندی کی دعویدار،
مگر دراصل جبر و تشدّد اور نسل کشی کی مہم پر
عمل پیرا حکومت پر اظہارِ غم کرتے ہوئے وہ
دیگر ممالک میں بھی اسی صورت حال کا ذکر
یوں کرتے ہیں:

اے خدا، کیوں اتنا دارو گیر برما بن گیا
ظلم کی منہ بولتی تصویر برما بن گیا

مل رہی ہے کس خطا کی اے خدا ان کو سزا؟
گویا پھر سے دوسرا "کشمیر" برما بن گیا

شام کی بے چارگی کیا کم تھی اے ربِ کریم!
کہ "فلسطیں" کی طرح دلگیر برما بن گیا

.....

ایک انتہائی کرب میں مبتلا حساس شاعر
جب صدائے احتجاج بلند کرنے کی خاطر قلم
اٹھاتا ہے تو کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُس
کے جذبات و احساسات فنی پابندیوں کی

گرفت سے آزاد ہو کر اپنے موقف اور موضوع کی سخت گرفت میں آ کر الفاظ لکھنے لگتے ہیں، تاہم رضوان حیدر رضوان اپنی جذباتیت اور شدّتِ احساس کی حالت میں بھی ایسے مشکل لمحات سے نکلنے میں زیادہ تر کامیاب رہے ہیں، مجموعی طور پر کئی مانوس زمینوں اور کئی طرحی مصرعوں پر بھی ان کی جو غزلیہ انداز کی شعری تخلیقات اس کتاب میں شامل ہیں اُن میں غزل کے روایتی موضوعات بھی اپنی پوری جمالیات کی جلوہ نُمائی کر رہی ہیں، مزید یہ کہ اُن کی تخلیقی توفیقات کا ایک اور روشن اور نمایاں تر پہلو اُن کی اسلامی و اصلاحی مثبت سوچ ہے جو قرآنی تعلیمات پر اُن کے پوری طرح عمل پیرا ہونے کی عکاسی کر رہی ہے۔

دو سو چالیس صفحات پر مشتمل اِس کتاب میں ڈاکٹر پیر سید محمد علی رضا بخاری السیفی اور سیّد منیر احمد بخاری کی تقاریظ کے علاوہ جناب ساجد اسلم، ڈاکٹر مقصود جعفری، سید شہباز گردیزی، ڈاکٹر فرحت عباس، نسیم سحر کے دیباچے یا اظہاریے بھی شامل ہیں جنہوں نے حاجی رضوان حیدر رضوان کی شاعری کے محاسن و موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے تجزیاتی تحاریر سے کتاب کو مزیّن کیا ہے۔ جبکہ خود مصنّف نے مختصر پیش لفظ میں اپنے تخلیقی سفر کی روداد بیان کرتے ہوئے اپنی شائع شدہ شعری تصنیفات کا مختصر تعارف بھی کرایا ہے جن میں نظم و غزل پر مبنی کتاب ''مضرابِ آرزو'' کے علاوہ اپنے تین نعتیہ مجموعے ضیائے طیبہ''، ''کرم حضور کا ہے'' اور ''عطائے محمدؐ'' شامل ہیں۔ ان کی تخلیقی زرخیزی کا تسلسل ان کے مستقبل قریب میں آنے والی نظم و غزل کی کتاب ''دلِ حزیں'' اور چوتھے نعتیہ مجموعے کی اشاعت کی نوید بھی دے رہا ہے۔ ''کربِ کشمیر'' معروف ناشر آواز پبلی کیشنز راولپنڈی نے اپنے روایتی انداز میں عمدہ گیٹ اَپ اور عنوان کی ترجمانی کرتے ہوئے سرِ ورق کے ساتھ شائع کی ہے، جس کی قیمت محض ۱۰۵۰ روپے ہے۔ سرِ ورق پر حاجی رضوان حیدر کا یہ شعر اُن کے کرب کا اظہار بھرپور انداز میں کر کے قارئین کو بھی اس کرب میں شامل کر رہا ہے:

قصّۂ غم نہ سناؤں گا تو مر جاؤں گا
کربِ کشمیر چھپاؤں گا تو مر جاؤں گا

.....

مَیں حاجی سید رضوان حیدر رضوان کو کشمیر کے حوالے سے کرب کے اس شعری اظہار کو ''کربِ کشمیر'' کے عنوان سے کتابی صورت میں لانے پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں اور اُن کی تخلیقی وسعتوں میں اضافے کے ساتھ ساتھ ایک پاکستانی اور ایک قلم کار کی حیثیت سے آزادیِ کشمیر کے لیے اُن کے ساتھ دُعا گو ہوں۔

وَمَا عَلَینَا اِلَّا البلاغ۔

☆☆☆☆☆

سید فخر الدین بلّے ..... ایک تہذیب ساز ہستی

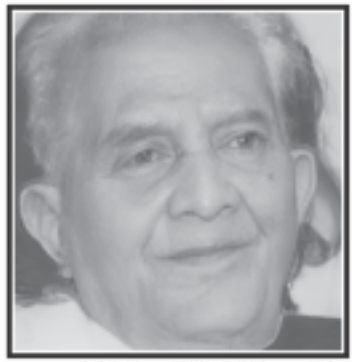

ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی چراغ علی گڑھ میں روشن ہو اور اس کی روشنی دور تک نہ پھیلے۔ کچھ ایسا ہی میرا تجربہ ہے کہ جو شخصیات علی گڑھ کی علمی اور تہذیبی فضا میں سانس لے لیتی ہیں، وہ دنیا میں کہیں بھی آباد ہو جائیں اپنے ساتھ وہی شرافت، دیانت، متانت، ذہانت اور تہذیبی اقدار لیکر جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک شخصیت فخر الدین بلّے صاحب کی ہے۔ ملتان اور لاہور کے قیام کے دوران میرا ان سے گہرا تعلق قائم رہا۔ وہ مجھ پر شفقت اور لطف و کرم کے کئی انداز آزماتے رہتے تھے۔ لب و لہجہ انتہائی مربیانہ ہوتا تھا اور حقیقی معنوں میں میری اور میرے ساتھ کے لوگوں کی سرپرستی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے تھے۔ گویا یہ ان کے مزاج اور شخصیت کا حصہ تھا۔ ایسے لوگ دوبارہ کسی معاشرے، کسی تہذیب کو نصیب نہیں ہوں گے، جن کے مزاج میں فنون لطیفہ کا رچاؤ اپنا معجزہ دکھاتا تھا۔

سید فخر الدین بلّے سے میری ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ محکمہ اطلاعات کے افسر اعلیٰ بن کر ملتان میں تعینات ہوئے۔ میں کالج کا طالب علم تھا، میرے ساتھ کالج کے وہ دوست جو علم و ادب سے دلچسپی رکھتے تھے اور شاعری، افسانہ نگاری اور کالم نگاری میں کچھ نام بنانا چاہتے تھے۔ اکثر ان کے دفتر حاضری دیا کرتے تھے، حسن پروانہ روڈ پر ان کا دفتر ہوتا تھا۔ اسی سڑک پر روزنامہ ''امروز'' کا دفتر بھی تھا جو اس علاقے کا سب سے مقبول واحد اخبار تھا اور ترقی پسند نظریات کا حامل تھا۔

اس اخبار کے ایڈیٹر مسعود اشعر تھے، جو اردو کے صف اول کے جدید افسانہ نگار ہیں۔

اصغر ندیم سیّد

مسعود اشعر الہ آباد (انڈیا) کے رہنے والے ہیں، اس لیے ان میں بھی مشرقی اقدار بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اکثر ہم طالب علم ان کے دفتر جا کر ان کی باتیں سنا کرتے تھے۔ وہاں اکثر سید فخر الدین بلّے صاحب بھی آیا کرتے تھے۔ ان کے ساتھ پروفیسر عرش صدیقی، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر فرخ درانی بھی آیا کرتے تھے۔ اکثر ان صاحبان کی موجودگی میں ادبی نشست بن جاتی تھی۔ ہم ان کی باتیں سن کر اپنے ذوق کی تربیت کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ یہ سب ادیب اور شاعر کلاسیکی ادب کا گہرا شعور اور ذوق رکھتے تھے۔ ان سب میں سید فخر الدین بلّے صاحب کی شخصیت من موہنی تھی، چونکہ وہ ہمارے استاد نہیں تھے۔ اس لیے ہمیں ان سے ڈر نہیں لگتا تھا۔ وہ دوستانہ انداز سے ہمیں اکثر اپنے دفتر لے جاتے تھے۔ ان کے دفتر کا ماحول عام سرکاری دفاتر سے قطعاً مختلف ہوتا تھا۔ وہ لگتا تھا ان کی لائبریری یا ان کے لکھنے کا کمرہ ہے۔ اس لیے کہ اس میں بے شمار کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا پورا ماحول ہوا کرتا تھا۔ ہر طرف کتابیں بکھری ہوتی تھی۔ ایک طرف بڑی میز پر چائے کا ساز و سامان رکھا ہوتا تھا۔ اکثر بلّے صاحب خود چائے بنا کر پیش کرتے تھے۔ کھانے پینے کی ہر ضرورت کا خیال رکھتے تھے۔ بے حد وسیع دل و دماغ کے مالک تھے اور ان کا دسترخوان ان کی آخری سانس تک بے حد وسیع رہا۔ دوست دار انسان تھے اور ہر طبقہ کے افراد سے ان کا گہرا تعلق تھا۔ سیاست، تجارت، ثقافت اور زندگی کے دیگر شعبوں کے افراد ان کے پاس آیا کرتے تھے اور وہ ان سب سے مروت و اپنائیت سے ملا کرتے تھے۔

چونکہ میرا گھر ان کے دفتر سے زیادہ دور نہیں ہوا کرتا تھا۔ میں اپنی سائیکل پر پہنچ جاتا تھا اور پھر کوئی نہ کوئی ملاقاتی وہاں موجود ہوتا تھا یا آجایا کرتا تھا۔ وہ ہمیں دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے کیونکہ محفل آرائی اور مجلسی ماحول انہیں بے حد پسند تھا۔ وہ سرکاری کام بھی ساتھ ساتھ نمٹاتے جاتے تھے اور نوجوانوں کی تربیت ایک غیر محسوس طریقے سے کیے جاتے تھے۔ کبھی کوئی غزل سناتے اور اس پر بحث شروع کر دیتے تھے۔ کبھی اپنے مطالعے کے حاصل سے ہماری رہنمائی کرتے تھے، کبھی اپنے ہم عصروں کی لکھی ہوئی چیزوں پر رائے دیتے تھے۔ اس طرح وہ اپنے مطالعے میں ہمیں شامل کر لیتے تھے۔ جو کچھ ہم کالج میں نہیں سیکھ سکتے تھے، وہ سید فخر الدین بلّے صاحب ہمیں غیر رسمی طریقے سے سمجھا دیتے تھے۔ سید فخر الدین بلّے صاحب بے حد خوش لباس اور جاذب نظر شخصیت کے مالک تھے، اوپر سے اللہ نے انہیں گداز سے بھری آواز عطا کی تھی۔ وہ بولتے تو لگتا کوئی محبت سے تھپکیاں دے رہا ہے۔ اکثر سفید رنگ کا لباس پہنتے تھے۔ شیروانی پاجامہ ان پر بہت سجتا تھا۔ علی گڑھ والوں کے لباس سے انہیں محبت تھی۔ اس لئے انہوں نے وہی مزاج اپنائے رکھا۔

ملتان میں دو نسلوں کی تربیت تو میرے تجربے کا حصہ ہے۔ اس دوران ان کی شاعری اور نثر مختلف رسالوں میں شائع ہوتی رہی اور ہم پڑھتے رہے، طفیل ہوشیار پوری نے ان کے ایک شعر کو ان کی زندگی کی کلید کے طور پر دیکھا ہے۔ میں بھی ان کا ہمنوا ہوں۔

تلاشِ رزق ہو یا جستجوئے معرفت بلّے

.....

ہماری زندگی شعر و ادب، یوں بھی ہے اور یوں بھی بلّے صاحب کی تعلیم سائنس کے مضامین میں تھی، لیکن انہوں نے سائنس سے سائنسی شعور لے کر ادب و شعر کو دریافت کرنے کو اپنی تخلیقی زندگی بنالیا۔ میں نے شروع میں لکھا ہے کہ وہ ایک مکمل تہذیبی شخصیت تھے۔ اس سے میری مراد یہ تھی کہ وہ مذہب، تصوف، اخلاقیات، سماجیات، نفسیات، ادب اور فنون لطیفہ سے یکساں جذباتی رشتہ رکھتے تھے۔ ان کے کام کا دائرہ بے حد وسیع ہے، مذہب اور عقیدے کے ذیل میں مولا علیؑ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے علم اور تفکر اور فلسفے کو سمجھنے کی انہوں نے بھرپور سعی کی۔ اگرچہ مولا علی کرم اللہ وجہہ کے علم اور فکر کو سمجھنے کے لئے صدیوں کی ریاضت کم ٹھہرتی ہے کہ جو تفصیل آپ کی ذات والاصفات سے منسوب ہے، وہ تہہ در تہہ علم کے آفاقی تصورات کو جنم دیتا ہے۔ کہاں ہم کہاں وہ۔ ایسے ہے جیسے سمندر کی وسعت کا اندازہ لگانا۔ فخر الدین بلّے نے اپنی عقیدت کے پھول تو نچھاور کئے۔ حضرت مولا علی کرم اللہ وجہہ کے کلام اور بلاغت کو صرف چوم لینا ہی بہت بڑی عبادت اور ریاضت ہے، بلّے صاحب نے اس کو محسوس ضرور کیا ہے اور شاید اس کی وجہ مشتاق معینی بہتر طریقے سے بتا رہے ہیں۔

''سید فخر الدین بلّے کا سلسلہ نسب خواجہ غریب نواز سے ہوتا ہوا، مولائے کائنات حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ بلّے صاحب سماع کے دلدادہ اور قوالی کے رسیا تھے۔''

یقیناً سید فخر الدین بلّے اجمیر شریف سے لیکر حضرت نظام الدین اولیاء تک پھیلے فیض سے جڑے ہوئے تھے۔ حضرت خواجہ غریب نواز اور حضرت امیر خسرو کی روایت سے جذباتی اور روحانی طور پر رچے ہوئے تھے۔ میں نے اور میرے دوستوں نے فخر الدین بلّے کی صحبت میں ان تمام نشانیوں کو بھانپ لیا تھا۔ اس لیے مجھے بہت روحانی سرور ملتا تھا، جب ہم ان کے آس پاس بیٹھے ہوتے تھے۔ مجھے ان کی شاعری کا تجزیہ نہیں کرنا۔ کیونکہ نقاد اکثر تجزیہ کرتے ہوئے اپنی ذات اور جذبات سے عاری ہو جاتے ہیں اور ایک پیشہ ورانہ میکانکیت کے سہارے خوانخواہ کی بحثوں میں الجھے رہتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے انہوں نے شاعری کو اخلاقی قدروں کی ترویج کے لئے استعمال کیا۔

شاعری کا بنیادی کردار انسان کی حسیات اور روحانی کیفیات کی ترویج و تہذیب ہوتا ہے۔ اس لئے مذہب اور عقیدے کو اس میں مرکزی حیثیت حاصل ہوا کرتی ہے۔ بلے صاحب نے اسی سے اپنی شعری کائنات بنائی ہے۔

میں لاہور میں 1980 میں آ گیا تھا اور اپنی ملازمت کے حوالے سے شکر گڑھ اور شیخوپورہ میں سزا کاٹ رہا تھا۔ سزا یہ تھی کہ ضیا الحق کے مارشل لا میں ترقی پسند لکھنے والوں کو ان کے شہروں سے نکال کر شہر بدر کیا گیا۔ ان میں مسعود اشعر ملتان سے لاہور آ گئے اور میں شکر گڑھ کالج میں تبدیل ہو گیا۔ یہ پاکستان کا ایک سرحدی شہر ہے، جو گرداسپور اور جموں کے کنارے آباد ہے۔ اس کے بعد میں لاہور آ گیا اور لاہور کی تہذیبی زندگی میں گم ہو گیا۔ اس دوران سید فخر الدین بلے صاحب کے متعلق معلوم ہوتا رہا کہ وہ کہاں کہاں کی خاک چھان کر لاہور میں آ چکے ہیں۔ اب پھر سے ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ جی او آر تھری میں سرکاری رہائش گاہ میں مقیم تھے۔ اب ان کے بیٹے بھی جوان ہو چکے تھے۔ آفس معین (مرحوم) سے تو میں مل چکا تھا۔ پھر ظفر معین سے تعلق قائم ہوا، جو اب تک ہے۔ وہ ایک بے حد حساس نوجوان ہے اور اب تو وہ صحافت اور تدریس میں قدم رکھ چکا ہے۔

سید فخر الدین بلے نے لاہور میں ہم خیال دوستوں اور ادیبوں کی ایک انجمن قافلہ بنائی۔ جس کے ماہوار اجلاس ان کے گھر پر ہوا کرتے تھے۔ اس میں شہر کے چیدہ چیدہ ادیب اور شاعر جمع ہوا کرتے تھے۔ ان میں مجھے یاد ہے ڈاکٹر وحید قریشی، انور سدید، ڈاکٹر سلیم اختر، احمد عقیل روبی، سائرہ ہاشمی، اسلم کمال، حسن رضوی، سرفراز سید، ذوالفقار نابش اور کچھ لوگ مستقل آنے والوں میں شامل تھے۔ مجھے بھی باقاعدگی سے دعوت ملتی تھی۔ کبھی کبھی میں نہیں جا پاتا تھا لیکن اکثر میری حاضری ہوتی تھی۔ دو تین دفعہ میں نے افسانہ اور نظمیں بھی پیش کیں۔ یہاں تواضع کے لیے انواع و اقسام کی لذیذ ڈشیں دسترخوان کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ خاص طور پر حلیم تو ان کے ہاں بہت لذیذ بنا کرتی تھی۔ انہیں مہمان نوازی کا اتنا شوق تھا کہ بس نہیں چلتا تھا روزانہ دوستوں کی دعوت کریں۔ شہر میں ان کے بہت سے شاگرد تھے اور طلبا ان کے پاس موجود لائبریری اور مختلف نادر کتابوں اور مسودوں سے فیض یاب ہوا کرتے تھے۔ وہ خود طلبا کی رہنمائی کرتے ہوئے بتایا کرتے تھے کہ ان کے پاس ایسا مخطوطہ ہے جو کہیں اور دستیاب نہیں ہے۔

سید فخر الدین بلے نام و نمود اور شہرت کی طرف کبھی خود نہیں لپکے۔ اس لیے مشاعروں کے بے حد مقبول شاعر ظفیل ہوشیار پوری کی رائے ہے کہ وہ ہمیشہ مشاعروں سے دور رہے، اسی

طرح ان کی رائے ہے کہ تصوف میں آپ کے خاص رجحان کی وجہ سے پیر حسام الدین راشدی، نامور مستشرقہ این ای میری شمل اور ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں تصوف پر اہم اتھارٹی قرار دیا ہے۔

ان کی غزلوں میں بھی تصوف کی جھلکیاں کہیں نہ کہیں موجود ہیں، چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

نہ آئینے کا بھروسہ نہ اعتبار نظر
جو روبرو ہے مرے، کوئی دوسرا ہی نہ ہو

یوں لگی مجھ کو خنک تاب سحر کی تنویر
جیسے جبریل نے میرے لئے پر کھولے ہیں

ہے ردا پوشی مری دنیا دکھاوے کے لئے
ورنہ خلوت میں بدلنے کو کئی چولے ہیں

انا کا علم ضروری ہے بندگی کے لئے
خود آگہی کی ضرورت ہے بے خودی کے لئے

ہے ایک قطرۂ خود ناشناس کی طرح
یہ کائنات مری ذات کے سمندر میں

میں کیا بتاؤں کہ قلب و نظر پہ کیا گزری
کرن نے قطرۂ شبنم میں جب شگاف کیا

ازل سے عالمِ موجود تک سفر کر کے
خود اپنے جسم کے حجرے میں اعتکاف کیا

خدا گواہ کہ میں نے خود آگہی کے لئے
سمجھ کے خود کو حرم عمر بھر طواف کیا

رہیں گے قصرِ عقائد نہ فلسفوں کے محل
جو میں نے اپنی حقیقت کا انکشاف کیا

اپنے اپنے دور کے عالموں اور صاحب بصیرت ادبا نے سید فخر الدین بلے کی شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں کو سراہا ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ بے حد ملنسار اور محبت کرنے والے انسان تھے۔ یہی خوبیاں ان کے کلام میں ظاہر ہوتی ہیں، ان کے بچوں میں ظفر معین بلے میرے بہت قریب ہیں اور ان کی وساطت سے پتہ چلتا رہتا ہے کہ وہ میرے ڈراموں کو شوق سے دیکھتے ہیں۔ خود سید فخر الدین بلے صاحب کو کئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے میری تعریف کیا کرتے تھے۔ میں اگرچہ ان کی رائے کو اپنے حق میں دعا تصور کرتا تھا اور خود کو اس تعریف کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ بلے صاحب کی زبان کی چاشنی ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوئی ہے، وہ جب بات کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے سید فخر الدین بلے گفتگو کر رہے ہیں۔ پورا گھرانہ ادب دوست اور علم دوست ہے۔ جب تک حیات رہے آخری سانس تک میل ملاقات اور مہر و الفتات کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ میں تو ان کی محبت کا قرض نہیں اتار سکتا کہ بیس سال کی عمر سے میں ان کے ساتھ رہا ہوں۔ آخری وقت تک میرا ان سے رابطہ رہا۔ اس رفاقت کا سفر اچانک ختم ہو گیا۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

☆☆☆☆☆

ایک خوش فکر اور قابلِ توجہ تخلیق کار

جناب علی رضا کا شمار نئی نسل کے اُن خوش فکر شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی تخلیقی فعالیت کو کئی رنگوں میں یکجا کر رکھا ہے.. اُن کے اُسلوب کی تازگی اور خیال کی خوش فکری دونوں زبانوں کے تخلیقی ادب میں سہولتِ اظہار کے یکساں نمونے پیش کرتی ہے۔ علی رضا شخصی سطح پر بھی اور تخلیقی اعتبار سے بھی ایک خوبصورت شخصیت کا نام ہے۔ اُن کے نام اور اُن کے تخلیقی سفر سے پہلے پہل میری آگاہی 1980 کی دہائی کے دوران ممتاز اور موقر ادبی جرائد "اوراق" اور "فنون" میں اُن کی غزلوں کی اشاعت سے ہوئی گویا وہ بنیادی طور پر ایک ایسے غزل گو شاعر ہیں جن کا تخلیقی مزاج غزل ایسی صنف میں قرار پاتا ہے شاید اسی سبب سے اُن کا پہلا شعری مجموعہ بھی غزلیہ شعری مجموعہ ہے جو "مفہوم" کے نام سے 2008 میں منظرِ عام پر آیا مذکورہ مجموعے میں شامل شاعری کی تحسین ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر خورشید رضوی، افتخار عارف اور سلیم کوثر سمیت متعدد معتبر و مقبول شعرا نے کی۔

علی رضا اس لحاظ سے بھی خوش بخت شعرا میں شامل ہیں کہ وہ بیک وقت جتنے اچھے غزل گو شاعر ہیں اتنے ہی اچھے نعت گو شاعر بھی ہیں بلکہ اُن کی ایک سعادت آسا ادبی شناخت یہ بھی ہے کہ وہ ایک خوش الحان نعت خواں بھی ہیں اور اس حیثیت سے بھی کئی بین الاقوامی ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں.....

غزلیہ مجموعے "مفہوم" کے بعد اُن کے دو نعتیہ مجموعے "ثنائے سرورؐ" (مطبوعہ 2013) اور "توصیفِ پیمبر" (مطبوعہ 2018) بھی

نثار ترابی

اشاعت پذیر ہوئے جنھیں بہت سراہا گیا۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شعر و ادب میں گزشتہ تین دہائیوں سے ان کا تخلیقی سفر جاری و ساری ہے علاوہ ازیں اُنھیں دینی، ادبی سرمائے کی ترتیب و تہذیب سے بھی خصوصی شغف ہے اور اسی شغف کی ہمدمی میں اُنھوں نے مختلف شعرا کا ایک نعتیہ انتخاب ''درود اُن پر سلام اُن پر'' (مطبوعہ 1999) اور مختلف شعرا کے سلاموں کا مجموعہ ''ہمارے ہیں حسینؑ'' (مطبوعہ 2012) پیش کرنے کی سعادت بھی حاصل کی اور اب اُن کا پنجابی نعتیہ کلام ہمارے پیشِ نظر ہے۔

برادرم علی رضا کی پہلی سعادت یہ ہے کہ آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت پر انتخاب کی توفیق پائی اور دوسری قابلِ ذکر سعادت یہ ہے کہ اس عمل کی قبولیت اس طرح سامنے آئی کہ پہلے اردو اور اب پنجابی زبان میں وہ اپنا نعتیہ کلام کتابی صورت میں ''پھلاں دی مہکار مدینے'' کے نام سے سامنے لائے ہیں۔ بے شک اللہ پاک جس عمل کو قبول فرماتے ہیں اُسے دوبارہ کرنے کی توفیق بھی ارزانی کرتے ہیں، اُس میں برکت عطا فرماتے ہیں اور بالخصوص سیرتِ سید السادات اور فخرِ موجودات کے موضوع پر اگر کوئی شخص اپنے تئیں کوئی فکری کاوش کرے تو اُسے دربار نبوت سے نقد ادائیگی بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ قبل ازیں اُنھوں نے نعتیہ کلام پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سلام و منقبت آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیش کرنے کی بھی سعادت حاصل کی اور اب اپنی ماں بولی میں نعت کہنے کی توفیق حاصل ہو جانا ہمہ جہت قبولیت کی دلیل ہے۔

رہی بات علی رضا کے فکر و فن کی تو سیرتِ مطہرہ سے عمدہ فکری خیال تو ہو ہی نہیں سکتا البتہ اس عظیم عنوان کو برتنے میں ان کا پاکیزہ تخلیقی عمل نہ صرف والہانہ ہے بل کہ ان کی عاجزانہ عقیدت مندی کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے شاعر نے فنی طور پر مختصر اور طویل دونوں طرح کی بحروں میں اپنا عقیدت مندانہ نذرانہ بحضور امام عالی مقام پیش کیا ہے اور ممکنہ حد تک اس کا شعوری التزام روا رکھا ہے کہ نعت کہتے ہوئے نعتیہ ادب سے وابستہ ممکنہ حدود و قیود اور شرائط و آداب کا خیال رکھا جائے۔ اس لیے کہ نعت کہنا جہاں لاریب ایک بڑی توفیق کی بات ہے وہاں نعت کہنے کے آداب کا خیال رکھنا بھی بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

دیکھیے مختصر بحر کی حامل اس نعت میں شاعر نے اظہار کے بے ساختہ پن کو اس عمدگی

سے نبھایا ہے کہ اس کا ہر شعر سہلِ ممتنع کا سا فنی امتیاز لیے ہم سے داد طلب ہوتا ہے۔ مذکورہ نعت سے دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

دل دیوانہ آقا دا
میں مستانہ آقا دا

اکھ شیدائی آقا دی
دل نذرانہ آقا دا

....

اسی طرح بے ساختگیٔ اظہار کے یہ مختصر نمونے دیکھیے جن میں اِذنِ حضوری کی تڑپ عجب والہانہ سرمستیوں میں ڈھلی ہوئی ہے۔

پا کے نام گداواں وچ
اڑدا پھراں ہواواں وچ
جی کردا ہن جا وسیے
اوہناں پاک فضاواں وچ

....

اور طویل بحر کے یہ رنگ بھی دیکھیے جن میں عاجزانہ اور عقیدت مندانہ شیفتگی کی خوشبو شاعرانہ خیال آرائی کو کیا حُسن عطا کر رہی ہے:

دل وچ یاد نبی دی ہووے، اکھ وچ شہر مدینہ ہووے
سوہنے دی توصیف لکھن دا، مینوں کاش قرینہ ہووے

میں بدکار گناہواں بھریا آپ دی رحمت عام اے آقا
میں عیباں دے ہڑھ وچ پھسیاں میرا پار سفینہ ہووے

نیز یہ کہ عاجزی، حدِ ادب، لجاجت، حفظِ مراتب اور عقیدت و محبت کا وفور، ہر ہر نعت کا جزو ہے جو اعلیٰ انسانی اقدار اور پاسِ ادب کا نمونہ ہے۔ مزید یہ کہ ہمارے یہاں زیارتِ طیبہ، روضہء رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری، وہاں سے دوری کی کسک، جانے کی تڑپ، واپس آ کر تشنگی بڑھ جانے کا احساس جو معاصر عہد کی بیشتر نعتیہ شاعری میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت اختیار کر گیا ہے ان کے یہاں بھی جا بجا اور برملا نظر آتا ہے:

دل وچ روشن یاد مدینے والے دی
اکھاں دے وچ وسدے جلوے طیبہ دے

حسن دی اصل حقیقت توں او واقف نیں
جناں لوکاں ویکھے رستے طیبہ دے

....

زبان میں سلاست اور غنائیت یکجا ہیں اور دقیق اور غریب دونوں قسم کے الفاظ سے شعوری گریز پایا جاتا ہے جو اس نعتیہ مجموعے کو اُسلوبیاتی اعتبار سے روانی اور معنی آفرینی عطا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی شعری ریاضت کو مزید تخلیقی توفیقات ارزانی فرمائے---

☆☆☆☆☆

''اُدرا کی تنقید'' نئی ادبی تنقیدی روایت کا تشکیلی و تفہیمی مطالعہ

یہ تحقیقی مضمون نئے ادبی تنقیدی نظریہ، "ادرا کی تنقید" کے جامع اور تعمیری تشکیل میں کارفرما عناصر کا تجزیاتی و تفہیمی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ اردو تنقید کے لیے بروئے کار لائے گئے نظریات، علمی و ادبی اور زمانی و مکانی اعتبارات سے قابلِ قدر اور قابل قبول روایت کا حصہ بن چکے ہیں۔ لہٰذا عصری شعری، افسانوی و دیگر نثری تجربات اور پیچیدگیوں کو سمیٹنے، سمجھنے اور کسی نتیجے تک پہنچنے کے لیے امکانی صورتوں کے مقابل نئے تجزیات و تشریحات کی ضرورت پہلے سے زیادہ محسوس کی جارہی ہے۔ ادبی تنقید میں روایتی نقطہ نظر کے برعکس، ادرا کی تنقیدی نظریہ داخلیت اور موضوعیت کے تناظرات میں کام کرتا ہے جہاں تنقید کا عمل غیر فعالیت سے نکل کر پُر جوش و بھرپور فعالیت سے متصف ہے۔ ادرا کی تنقید، بنیادی طور پر ایک عمیق باطنی اور خارجی عناصر کی تعاملیت کا حاصل نظریہ ہے، جو تخلیقی پیرائے میں ہی وارداتِ قلب و ذہن کے تخلیقی اظہار کے تجزیہ و تفہیم کو ایک مخصوص نادر، مدلل اور تازگی بخش اظہاری منہج فراہم کرتا ہے۔ یہ اختراعی نقطہ نظر روایتی اور مروجہ ادبی تنقیدی تمثیلوں سے منفرد اور نئے فریم ورک کو متعارف کراتا ہے جو تخلیق کی موضوعی اور تجرباتی جہتوں پر مرکوز ہے اور عصری ادبی مطالعات کے وسیع تر منظرنامے میں اس کی مطابقت کو واضح کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: ادرا کی تنقید، تعمیری تجزیے، تشکیلی و تفہیمی صورت، نظریہ، روایتی، باطنی و خارجی، مروجہ تنقید

''ادرا کی تنقید'' : نئی ادبی تنقیدی روایت کا تشکیلی و تفہیمی مطالعہ

ڈاکٹر اسد محمود خان (1)

تنقید کیا ہے اور تنقید کیسے تخلیق کی ادبی معاونت کا ذمہ نبھا سکتی ہے؟۔

تنقید تجرباتی اور تصوراتی امکانات کے درمیان ایک تخلیقی اظہاریے کی صورت ہوتی ہے جو تخلیقی عمل کے دوران برتے جانے والے کشت کارِ جہاں کے پختہ تجربات کی تخلیقانہ نمائندگی اور تخیل کے لامحدود دائروں کے درمیان ایک نفیس تعامل کے طور پر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ یہ بحث نتیجہ طلب رہی گی کہ تخلیق و تنقید کے مابین

اسد محمود خان

تقابل یا اشتراک میں کس کا پلڑا بھاری ہوگا البتہ باہمی جڑت کی سچائی ہنوز باقی ہے۔ تجربے، علمیت اور اظہاریے کا ایک مثلث میں جڑ جانا، ادراک (Perception) کی صورت گری کرتا ہے۔ خارجی تجربات، داخلی ردِعمل یا داخلی تجربات اور خارجی ردِعمل، رویے یا اظہار کی باہمی تال میل سے ہم آہنگ ایک منفرد شکل کو جنم دیتے ہیں جو ایک تخلیق، تخلیق کار اور تخلیق کے قاری کے درمیان ایک ادبی رابطے کی صورت کرتا ہے جسے تنقیدی تجربے یا تنقیدی تخلیق کہا جائے گا جو ادب کے اندر ایک جذباتی کھوج کا مضبوط اظہاریہ ہے۔ تجرباتی اور تصوراتی امکانات کے درمیان جوہرِ لطیف پہنچانے کی کوشش ادبی تنقید کے تجرباتی دائرہ کار میں توثیق کی کوشش ہوتی ہے جہاں درستگی معنوی تشریحات اور فنکارانہ صداقت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ کلیم الدین احمد، ''تنقید کیا ہے؟'' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تنقید، متنوع تجربات کو جانچنے اور ان کی قدر کا تعین کرنے کے عمل کا نام ہے جو اپنی خالص ترین شکل میں، تخلیقی قدر کا ایک لازمی عنصر ہے۔ فن کی خود ملکیتی عمل میں یہ تسلیم کرنا لازم ہے کہ تخلیق زندگی کی آگہی کے مظہر کے طور پر کام کرتی ہے، جب کہ تنقید آرٹ میں موجود شعور کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے"۔ (1)

ریٹا فلسکی (Rita Felski)، ادبی تنقیدی ترجیحات اور استعلالات کے بارے میں رقم طراز ہے:

''تنقید، تخلیق میں پہلے سے موجود طاقتوں کو بڑھاوا دینے میں معاونت کرتی ہے نہ کہ ان کو رد کرنے یا الجھاوا دینے کی کوشش کرتی ہے۔''(2)

بنیادی طور پر تنقید، ہمارے فکری منظرنامے کا ایک عمیق اور متحرک پہلو ہے، جس کی خصوصیت تخلیق اور نقاد کے درمیان مسلسل ایک علمی، شعوری اور ادراکی مکالمے کی گنجائش کا اہتمام کرنا ہے۔ تنقید، حقیقی طور پر یہ تخلیق کا ہی ایک منفرد معاملہ ہے جو اظہاریے کے تخلیقی وجود کی مابعد علمی و شعوری تجسیم میں تخلیقی و تنقیدی زندگی کی روانی کا معاملہ سنبھالتی ہے۔ سید احتشام حسین، تنقید کی اہمیت و افادیت کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''تنقید، منطق کی طرح ہر علم و فن کی تشکیل و تعمیر میں شریک ہے بلکہ وجدان اور جمال کے جن گوشوں تک منطق کی رسائی نہیں ہے، تنقید وہاں پہنچتی ہے۔ وہ رنگ و بو اور کیف و کم کے غیر متعین دائرہ میں صرف قدم ہی نہیں رکھتی بلکہ ابہام میں توضیح کا

جلوہ اور بے تعینی میں تعین کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔" (3)

ٹیری ایگلٹن (Terry Eagleton)، تنقیدی معاملات پر مباحث سمیٹتے ہوئے رقمطراز ہے:

"تنقید، دستگاہ اصلاح، نادیدہ انحراف اور خودسر رویے کا مرہم ہوتی ہے۔ تاہم، اس معاونِ اصلاح کو مخصوص آزادی اظہار کی آڑ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جب کہ ادبی تنقید کا میدان، ابھی تک ایک بے لاگ اظہار کے طور پر تیار نہیں ہوا ہے۔ یہ ایک وسیع تر اخلاقی انسانی دائرہ کار کا معاملہ ہے جو اخلاقی، ثقافتی اور مذہبی تحفظات سے الگ نہیں ہے۔" (4)

فنکارانہ پیش کش کی جذباتی اساس انسانی (تخلیق کار)، فنکارانہ پیش کش کی تجزیاتی اساس تخلیق کے قاری یا نقاد کے انفرادی تجربے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ تخلیق، زندگی کے شعور کے ایک واضح مظہر کے طور پر اپنی تجسیم مکمل کرتی ہے جو ایک نئی دوشیزہ کی طرح اپنے سراپا، خدوخال اور کردار کی توجہ چاہتی اور شناخت کا مطالبہ کرتی ہے۔ تخلیقی معنویت کے الجھاوے میں تنقید ایک سہیلی کی طرح داخل ہوتی ہے تخلیقی تانے بانے میں علمی اور شعوری تہہ داریوں کی پرتیں کھولنے اور کشافی رنگوں کی تفہیم بانٹنے کے لیے خود کو پیش کرتی ہے۔

جوزف نارتھ (NorthJoseph)، تخلیق اور تنقید کے درمیان ایک متحرک تعلق کا بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"تنقید فنکارانہ پیش کش کا جائزہ لینے کی ایک سعی کا معاملہ ہے جو تخلیق کار اپنے کارگاہ زیست کے حاصل کی ممکنہ تعبیرات کو مدنظر رکھتے ہوئے قاری کے سامنے پیش کرنے کی جسارت کرتا ہے۔" (5)

آل احمد سرور، تخلیق و تنقید کی باہمی جڑت کے بارے میں رقمطراز ہیں:

"بڑے تخلیقی کارنامے بغیر ایک اچھے تنقیدی شعور کے وجود میں نہیں آسکتے۔ تخلیقی جوہر بغیر تنقیدی شعور کے گمراہ ہو جاتا ہے اور تنقیدی شعور بغیر تخلیقی استعداد کے بے جان رہتا ہے۔" (6)

تخلیق، تخلیق کار اور تخلیق کا قاری کی باہمی جڑتی تکوین کے مرکز میں، تنقید کو ایک مسلسل اور متعامل صورت کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جس کا مقصد تخلیق اور نقاد کے درمیان مستقل مکالمے کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ تنقیدی مکالمے اور مباحث، روایتی تنقید کے مروجہ اصولوں کی بازیافت، اور جدید نظریات و اطوار کی معاونت کے مابین تعاملاتی نقد و نظر کے ظاہری و باطنی مبین دائروں میں تشکیلی و تعبیراتی خدوخال

تلاشنے کا سامان کرتی ہے۔ تنقید میں نئے زاویوں اور سانچوں کی ضرورت نہ صرف تخلیقی تنوع اور تعبیر کے لیے ایک موضوعی ترجیح ہے، بلکہ یہ تخلیق کار اور نقاد کے شعوری وادراکی تحرک اور مسلسل ارتقائی علامتیت کی دلیل بھی ہے۔ زمانی و مکانی تغیرات جہاں کثیر جہتی تخلیقی تجرباتی تنوع کا سامنا کرتی ہے، وہاں موضوعاتی تہدید اور طرزِ تہدید کی ایک منفرد صورت سامنے لاتی ہے۔ دوسری جانب ایسی تخلیقی تجسیم کی تفہیم و تعبیر تک رسائی کے لیے کثیر جہتی تجرباتی تنوع اور فکری منہاج کے ارتقا کی ضرورت بھی بڑھ جاتی ہے۔ ادبی تنقید، تخلیق شناسی اور تخلیقی ارتقا میں ایک پُر فعال ادبی آلے کے طور پر کام کرتی ہے۔ تخلیق و تنقید میں نت نئے رجحانات، تحاریک اور انفرادیت کی ضرورت، ایک فطری فکری تجسس ہی نہیں بلکہ ایک ادبی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ موجودہ عالمی منظر نامے اور عالمی ادب کے رجحانات، ادبی تخلیقیت، شناخت اور ادراک سے متعلق تنقیدی رجحانات کی تازگی کے متقاضی ہیں۔(2)

اردو ادبی تنقیدی مزاج کیا ہے اور کیا یہ تخلیقی معاونت کی ذمہ داری نبھاتا ہے! علمِ بیان و معنی؛ لفظ و معنی کی باہمی جڑت سے تشکیل پانے والے جملوں کی بُنت اور بناوٹ کا شعور؛ ترسیلی خیالات سے ابھرنے والے خدوخال کا ادراک ایک علمی، شعوری اور ادراکی مثلث کی تمثیل ہے جہاں تکوین کے مرکزے میں جنم لینے والے سوالات در حقیقت تخلیق، تخلیق کار اور تخلیق کے قاری کا سانجھا رویہ ہوتا ہے جو تینوں پر متنوع معنویت اور متعدد زوایہ ہائے تفہیم کے ساتھ مقصود تخلیق ہوتا ہے۔ تخلیق، کثیر جہت یا متنوع المزاج صورتوں میں، انسانی تسکین اور بالیدگی روح کے لیے ایک تخلیقی پیمانے کے طور پر کام کرتا ہے، جو کیفیات و جذبات، احساسات و خیالات اور تجربات و انتقادات کے بہاؤ اور دھارے پر بڑھتا ہے۔ تخلیق اپنے ہر روپ میں، چاہیے رنگوں کے جہان سے کشید ایک نیا جہانِ رنگ و بُو، قلمِ مُو کے انداز رقص سے پھوٹتے نقوش، رقص کناں ابدان کی نیم دائروی پھیروں کی دھمال، اصول نغمگی کی تان پر اُترے موسم کا مزاج ہو، تخلیقی اظہاریہ زندگی کے شعور کی کثیر سمتی جہتوں کی عکاسی کرنے والے آئینے کا کام کرتا ہے۔ عین بعین تنقید، متنوع المزاج تخلیقی صورتوں کی علمی، فکری، شعوری معاونت کے لیے خود کو پیش کرتی اور تخلیق و تنقید کے مابین باہمی مکالمے بلکہ ایک خوبصورت، پُر مغز اور بامعنی مکالمے کی عملی

صورت کا سامان کرتی ہے۔

سید محی الدین قادری زور، تنقید کا مقصد بیان کرتے ہوئے ہیں:

"تنقید کا بنیادی مقصد صرف منفی پہلوؤں کی مذمت کرنا نہیں ہے بلکہ ان کا درست تجزیہ کر کے مثبت پہلوؤں کی نشاندہی، جاندار تجزیہ اور فنی تشریح کو فروغ دینا بھی ہے۔" (7)

اگرچہ تنقید، نقد و نظر کا معاملہ ہے لیکن یہاں نقد و نظر سے ہرگز مراد وہ تجسیم و تفہیم نہیں جو تخلیق کی صورت اولین تھی اور نہ ہی اس سے مراد تخلیق کی بے پردگی ہے بلکہ یہاں اس سے مراد تخلیق کی صورتِ دیگر ہے جو ادراک کی تفہیم و تجسیم کا حاصل ہے جس کے کئی ایک روپ بھی ہو سکتے ہیں اور تخلیقی خوب صورتی و غنائیت بھی اس کا مطمعِ نظر ہوتا ہے۔

لیجو کول (Cole Teju)، تخلیق و تنقید کی باہمی معاونت کا تعلق کھولتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تنقید اور تخلیق کے درمیان ایک غیر محفوظ حدود کی عصری تفہیم کی عکاسی یہ ظاہر کرتی ہے کہ تخلیق و تنقید کس طرح ایک دوسرے کی معاونت کرتے ہیں اور کس طرح ایک دوسرے کو متحرک کر سکتے ہیں۔" (8)

زیڈی اسمتھ (Zadie Smith)، رقمطراز ہے:

"تخلیق کے ساتھ ناقدانہ وابستگی کسی کے اپنے تخلیقی عمل کو تشکیل دینے کی طاقت رکھتی ہے، جو تخلیق کار اور نقاد کے درمیان باہمی تعلق کو اجاگر کرتا ہے۔" (9)

تنقید، تخلیق کا علمی، ادبی، شعوری اور ادراکی جائزہ لینے کے بعد ہی اس کی تعمیر و تعبیر اور خوبیوں خامیوں دونوں کو کھولتی اور تسلیم کرتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے، تنقید ایک دوہرا فعل ہے، جس میں نہ صرف تنقیدی باریکیوں کی سختی، درشتگی اور درشتگی ہے بلکہ اس میں ایک تخلیقی معاونت کا پہلو بھی نمایاں ہوتا ہے۔ اردو، تنقیدی مزاج میں سختی اور درشتگی کا عنصر تو روزِ اول سے موجود رہا بلکہ تنقید ایک ممکنہ اور مضبوط ہراسگی آلے کے طور پر نمایاں رہی۔ اگرچہ کہیں کہیں تخلیقی معاونت نے اسے تخلیق کی صورت اولین سے زیادہ قبول صورت بھی بنایا لیکن مجموعی معاملہ مذکور اول جیسا رہا ہے۔ یوں، پُر مغز شعوری فہم اور ادراکی بازیافت سے بھرپور تنقید، تخلیقی معاونت کا ایک ذریعہ ہوتی بن کر سامنے آئی، جو محض تنقید سے بالاتر ہے۔

نور الحسن نقوی، تنقیدی ناگزیریت اور تخلیقی معاونت بارے لکھتے ہیں:

"تنقید اور تنقیدی شعور، انسانی وجود کے دیگر تمام پہلوؤں کے ساتھ ادب کے دائرے میں بھی لازمی جزو ہے۔ تنقید کی دو صورتیں ہیں: ایک جو تخلیقی عمل کے دوران

تخلیق کار کی مدد کرتی ہے، اور دوسری جو تخلیق اور قاری کے درمیان تعلق قائم کرتی ہے۔"(10)

ٹی ایس ایلیٹ (T.S.Eliot) تنقید و تخلیق کی باہمی معاونت کے بارے رقمطراز ہیں:

""تنقیدی عمل تخلیقی کوششوں سے الگ نہیں ہوتا۔ بلکہ، یہ ادب کی زندگی میں فعال طور پر حصہ ڈالتا ہے۔"(11)

ڈاکٹر سلیم اختر، "تخلیق، تخلیقی عمل اور تخلیقی شخصیت کا مطالعہ" میں لکھتے ہیں:

""اگرچہ تنقید کو ہمیشہ سے تخلیقات کی پرکھ کے لیے استعمال کیا جاتا رہا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ تنقید کے وسیع تناظر کو محدود کر دینے اور عمل نقد کے وسیع اور پر تنوع کل میں سے محض ایک یا چند اجزا منتخب کر کے محیط بے کراں کو ذرا سی آبجو میں مقید کر دینے کے مترادف ہے۔"(12)

تخلیق کی تنقیدی معاونت کا معاملہ ایک متقابل جہانِ جہات کی فکری و شعوری پیش کاری سے پرے ایک نئے جہانِ جہات کی بازیافت کی ادراکی تفہیمات کی کھوج کا معاملہ ہوتا ہے۔ تخلیق کو تنقیدی نقطہ نظر سے پرکھ کے معیارات پر رکھ کر، اس کا موازنہ فنکارانہ مہارت سے پیش کی گئی تخلیق کی تعبیر سے کیا جا سکتا ہے۔ تنقیدی عمل، تخلیقی عملی کی طرح شدت احساس پر پھوٹنے والے جذبات اور کیفیات سے ہوتا ہے جو یقیناً ایک مشکل اور تکلیف دہ عمل ہے جو تخلیقیت کے دائرے کو بڑھاتا ہوا تخلیق کار سے ناقد اور ناقد سے تخلیق کار کی جانب آتا ہے۔

اگرچہ یہاں تخلیقی وجود بظاہر ایک ہی رہتا ہے لیکن تخلیقی باطن ادراکی جُون مطابق ڈھل جاتا ہے اور تخلیق کار کا روپ، ناقد کا روپ ہو جاتا ہے۔ اس پورے عمل میں تخلیقی کوتاہیوں اور بدصورتیوں کو تنقیدی باریکیوں کی معاونت سے ایک نئی تفہیم کے قالب میں منتقل کیا جانا، ایک نئی تخلیقی کشت کا سلسلہ ہے جہاں تخلیق اپنی ادراکی تجسیم کی صورت ٹھہرتی ہے۔ یُوں تخلیقی معاونت کا کردار، تنقیدی مزاج کی علمی و ادبی قبول صورتی کا ایک ایسا مضبوط حوالہ اور جواز فراہم کرتا ہے جس احساس موجود ہو البتہ تشکیل و تکمیل کی صورت ہنوز تشنگی کی سی رہتی ہے۔(3)

کیا اردو ادبی تنقید کی نئی تفہیم اور نئے تنقیدی نظریہ کی ضرورت اور گنجائش باقی ہے! گزشتہ کئی دہائیوں سے اردو ادبی تنقیدی دبستان خصوصاً کہانی سے جڑی اصناف ادب یعنی ناول اور افسانہ کے تنقیدی مزاج میں یکسانیت اور مغربی تخلیقی و تنقیدی سانچوں کا برتاؤ جہاں تنقیدی معیارات کو ادبی مقامیت کے کٹہرے میں

جواب نہیں دے پایا وہاں اس نے کہانی کے وجود کا مقدمہ بھی کمزور کیا ہے البتہ شاعری کو مخصوص استغاثہ کی سہولت کہیں کہیں میسر رہی ہے مگر سخن کو متن کا نام دے کر اس کی پرکھ پرچول کو ترجیح دیتے ہوئے جس طرح تخلیق کار کو باہر نکال پھینکنے کو نظریہ بنا کر پیش کیا ہے اس نے پورے تخلیقی منظر سے روح نکال کر بے جان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اردو ادبی نظریات و تحریکات کے الجھاوے میں، تنقیدی گھمبیرتا میں مذکورہ مسئلے کا ادراک اور اس سمسیا سے نکلنے کی کوشش کسی تخلیقی سرگوشی کی بازگشت کی طرح دراصل نئی تمثیلات کا ظہور عصری ادب اور تنقیدی دبستان کے درمیان تخلیقی رواق حیات کے مصداق ہے۔ تخلیقی و تنقیدی ادبی ارتقا کا معاملہ، نئی ضرورتوں، ترجیحات اور تشکیلات سے جڑا ہے جو جہاں تخلیقی تازگی کی خواہش رکھتا ہے وہاں تنقیدی تازہ کاری کی امید، دراصل تخلیق کی بقا کی امید جیسی ہے۔ اردو تنقیدی ادب کے موجودہ نظریات، علمی و ادبی اور زمانی و مکانی اعتبارات سے قابلِ قدر ہونے کے باوجود حقیقت میں اپنی قدر اور قبولیت کھو چکے ہیں لہٰذا عصری شعری و افسانوی نثری تجربات پیچیدگیوں کو سمیٹنے، سمجھنے اور نبیڑنے کے لیے امکانی صورتوں کے مقابل نئے تجربات و تشریحات کے متقاضی ہیں۔ ہنس برٹنز (Hans Bertens) ادبی نظریہ کی ضرورت و اہمیت کو مدنظر رکھ کر لکھتی ہے:

"ایک وقت تھا جب ادبی متون اور ادبی نظریہ کی تشریح دو مختلف اور تقریباً غیر متعلق چیزیں لگتی تھیں۔ تاہم، پچھلے تیس سالوں میں، تشریح اور نظریہ ایک دوسرے کے اس قدر قریب آئے ہیں کہ متن کی تشریح، نظریاتی نقطہ نظر کے بغیر اور نظریہ تشریح کے بغیر مکمل دکھائی نہیں دیتا ہے۔" (13)

سید احتشام حسین، "ادبی تنقید کے مسائل" میں لکھتے ہیں:

"ماحول، تشکیلِ شعور کو متاثر کرتا ہے خواہ وہ کتنا ہی بے ساختہ، شدید اور آفاقی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا، تنقیدی عمل کی اساس، تخلیق کی فکری اساس ہے جو علمی، ادبی اور سماجی اثرات کا حاصل ہوتی ہے جسے خارجی اثر پذیری کہہ سکتے ہیں"۔ (14)

نظریہ کیا ہے! ایک قیاس یا نکتہ نظر جس کا مقصد کسی چیز کی وضاحت کرنا بلکہ خاص اصولوں یا نکتہ نظر کی روشنی میں بیان کرنا؛ ایک رجحان یا سوچ کے نتائج سے کشید تجریدی سوچ کی ایک عقلی قسم؛ مشاہدہ یا تحقیق، غور و فکر یا عقلی سوچ کی ترجمانی کا سلیقہ؛ قابل فہم یا سائنسی طور پر قابلِ قبول عمومی اصول یا مظاہر کی وضاحت کے لیے

پیش کردہ اصولوں کا مجموعہ؛ عمیق مطالعہ اور منظم مشاہدے کی بنیاد پر مظاہر کی ایسی وضاحتی کوشش کہ جس کو رد، قبول یا درست کیا جا سکے؛ انفرادی یا مجموعی خیالات کا تسلسل جسے اجتماعی قبولیت حاصل ہو؛ یہ سب کچھ ایک نظریہ ہے اور یہی ادبی نظریہ کے خدوخال کی عملی تصویر و تشہیر کی صورت بھی ہے۔

سارا اپسٹون (Sara Upstone) لکھتی ہے:

"مطالعہ اور مشاہدہ کے دوران جنم لینے والے سوالات کے جوابات جن کا تعلق معنی، فعل اور تاثیر سے ہوتا ہے، کا مجموعہ ادبی نظریہ ہے۔ متن کے جوابات اکثر غیر متوقع اور پیچیدہ ہوتے ہیں جب کہ متن کے بارے میں سوچنے کے خاص طریقے کا حصول ادبی نظریہ سے ہی ممکن ہوسکتا ہے۔"(15)

اردو ادب کی تنقیدی روایت کا باقاعدہ آغاز حالی کی تنقیدی روایت سے جوڑا جاتا ہے جب کہ بعد کے تنقیدی دبستانوں میں حسن عسکری کی تجزیاتی تنقید، رومانوی تنقید سے وابستگان میں مجنوں گورکھ پوری اور سجاد انصاری؛ تاثراتی تنقید کے روحِ رواں میں شبلی، آزاد، عبدالرحمٰن بجنوری، نیاز فتح پوری، رشید صدیقی؛ جمالیاتی تنقید میں مہدی افادی، اثر لکھنوی؛ مارکسی، تاریخی اور سماجی تنقیدی نظریات کے حامی اختر حسین رائے پوری، احتشام حسین، ممتاز حسین ایک اہم حوالے کے طور پر موجود ہیں لیکن عملی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ حالی نے ایک نظریاتی فریم ورک پیش کرنے کی کوشش بلکہ قدرے کامیاب کوشش کی تھی جب کی بعد میں کی جانے والی تنقید نے یا تو پہلے سے موجود سانچوں پر اکتفا کیا یا پھر مغربی تنقید کو مشرقی پیرہن میں سمونے کی کوشش کی۔ مشرقی تنقیدی روایت میں مغربی تنقیدی روایت کی دراندازی یا اثر پذیری نے جہاں مشرقی تاثیر، مقامی نظریہ اور اردو ادبی سانچوں کو متاثر کیا وہاں ارتقائی عمل کو بھی روک دیا۔ تخلیقی و تنقیدی عمل کا تسلسل ایک ٹھہراؤ یا جمود کا شکار ہو جائے تو یہ صرف ادبی منظر نامے کا سکوت ہی نہیں ہوتا بلکہ تہذیب، ثقافت، سماج، معاشرت، ذہنی، فکری، شعوری عدم تسلسل اور خلا کی علامت بھی ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں بگاڑ، مجروح یا مخلوط نظریات اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس کے نتائج دیر تلک اثر انداز ہوتے ہیں۔ اردو تنقیدی روایت میں مروجہ ڈھانچے مغربی روایت کی دین ہیں جن میں تشریحی، سائنسی، تجزیاتی، استقرائی، تقابلی، رومانی، جمالیاتی، تاثراتی،

تاریخی، عمرانی، نفسیاتی، مارکسی، ہیئتی، اسلوبیاتی، ساختیاتی اور امریکی طرزِ تنقید کے نظریہ نو انسانیت اور شکاگو فکر کی دراندازی اپنی تمام تر حاکمیت کے ساتھ اردو ادبی روایت کی علمی، ادبی اور فکری تربیت کرنے کا جواز لیے کارفرما ہے۔ اگرچہ گوپی چند نارنگ نے ''ساختیاتی'' اور ''پس ساختیاتی'' نظریہ تنقید کو اردو قالب کی شناخت دینے کی کوشش کی لیکن اس کا مغربی تاثر بہر طور غالب رہا۔ البتہ حامدی کاشمیری کے تنقیدی نظریہ اکتشافی تنقید جو 'قائم بالذات' نظریہ کے ساتھ ادب سے 'باطنی' تعلق کی توثیق کرتی ہے لیکن اپنی انفرادیت اُس وقت کھو دیتی ہے جب کہیں کہیں 'ہیتی تنقیدی نظریہ' سے قریب کی تاثیر محسوس ہونے لگتی ہے یا کہیں کہیں 'ساختیاتی' اور 'اسلوبیاتی' کے آس پاس گھومتی دکھائی دیتی ہے۔ البتہ حامد کاشمیری 'تمدنی تنقیدی نظریہ' کا بیان کرتے ہوئے کچھ حد تک منفرد دکھائی دیتے ہیں جہاں ادبی ماہیت، فردیت اور علمیت کے ساتھ فکری و جمالیاتی تشریحات نمایاں ہوتی ہیں۔ اسی روایت میں ڈاکٹر فہیم اعظمی کی 'نسوانی تنقید' کی آواز بھی مغربی 'پدری جبریت' کا تسلسل ہی ٹھہرتا ہے۔ دوسری جانب 'مکتبی تنقید' نے ایک نظریہ بلکہ 'نظریہ ضرورت' جیسی شکل اختیار کر رکھی ہے جس میں نظریے کا فریم ورک ہونے کے باوجود تعلیمی ڈگری کے حصول سے زیادہ کا معاملہ طے نہیں ہوتا ہے جب کہ 'تقریباتی تنقید' نے تخلیق یا تخلیق کار کی معاونت سے زیادہ عدم تعاون کی صورت بنا رکھی ہے۔

فرحت عباس شاہ، ادرا کی تنقید کا جواز اور نئی فلسفیانہ ضرورت کی وجوہات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مغربی رجحانات کی سرعت انگیز دراندازی، نفسیاتی بحران اور فرد کے بے معنی ہونے کا احساس، مغربی نظریات کا پرچار، فکری آزادی پر قدغن، ادراک کی داخلی تعبیر کے بجائے خارجی ڈھانچوں کا رواج، منہدم شناخت اور معنویت، مصنوعیت کا رواج اور لاحاصل و غیر سنجیدہ مکالمے کی فضا کے درمیان ادرا کی تنقید کا جواز توجہ طلب ضرورت جیسا ہے۔ "(16)

ادبی تنقید کے ارتقا کے لیے ایک لازمی امر عصری ادب کے اندر آوازوں کے باہمی ربط میں مضمر ہے۔ مروجہ تنقیدی تشریحات و نظریات، روایتی اندازِ نقد و نظر کا حاصل ہیں جو جدید ادبی منظر نامے میں موجود شناختوں اور تجربات کے متنوع مزاج کو سمجھنے میں اکثر تشنہ دکھائی دیتے ہیں۔ ایسی درپیش صورت میں ایک نیا اندازِ فکر، نئی تشریحی عمق اور نئے نظریات کی ضرورت

لازم ہوتی ہے خاص طور پر جس کی جڑت اور جڑیں باہم مربوط اور معاونت کے جذبے سے معمور ہوں، وہی تنقیدی نظریہ عصری تقاضوں کی خلیج پاٹ سکتا ہے کہ جس سے فکری و تخلیقی شعور، تنقیدی ادراک، تخلیق و تنقید اور تخلیق کار و نقاد کی شناخت، اور دیگر عصری موضوعات و معاملات جنس، جذبہ، نسل، نظام اور ایسے بہت سے تند و تیز اور عمیق پہلوؤں کا ادراکی تجزیہ پیش کرتا اور معاصر ادبی روایات کا ایک بھرپور منظر نامہ کی تشکیل کرتا ہے۔ ادبی اظہار کی مسلسل پھیلتی ہوئی کائنات میں، انواع کی حد بندی کرنے والی روایتی حدود غیر محفوظ ہو چکی ہیں، ایسی صورت ایک نئے ادبی منظر نامے کا در وا کرتی ہے جہاں متنوع الامزاج اور متعدد الانواع عناصر باہمی اشتراکات کی فضا بناتے اور 'ہائبرڈٹی' یا 'مخلوطیت' کو جنم دیتے، فکری و جمالیاتی بدلاؤ کا احساس دلاتے، شعوری و ادراکی تشریحات کی حدیں دراز کرتے اور خود کی تشکیل نو کرتے ہیں۔ یہی وہ غالب رویہ ہے جو نئی تنقیدی فکر، تشکیل اور تعامل کی پیشن گوئی کا اشارہ دیتا ہے۔ عصری منظر نامے میں بدلاؤ اور رچاؤ کے درمیان ادبی تشکیلات کا بدلاؤ ایک ایسا ضروری امر بن جاتا ہے جہاں دیگر اہم ترین عوامل میں ڈیجیٹلائزیشن کا انفلوئنس بھی نظر آتا ہے جس نے تخلیق اور قاری کے ساتھ ناقد کی تفہیمی تربیت کو بھی متاثر کیا ہے۔ نئے تنقیدی نظریہ کی ضرورت یا پیش رفت، متقدمین کی یکسر رد یا ردِ عمل کا معاملہ نہیں بلکہ پیش منظر کے ادبی منظر نامے میں ایک نئی ضرورت، نوعیت اور فریم ورک کی اثر پذیری کا معاملہ ہے جو علمی و فکری ضرورتوں کی طلب اور کھوج سے جڑا ہے۔ (4)

ادراکی تنقید کیا ہے اور یہ کس طرح تخلیقی معاونت کا کردار نبھاتی ہے! ادراکی تفہیم، تجربے یا اظہاری ردِ عمل کی تشکیل جو تخلیق کار اور تخلیق کے قاری کی جذباتی کیفیات کا نتیجہ ہے اور علم، عمل اور احساس کے باہمی تعامل سے جنم لینے والے تنقیدی اظہاریے کا پہلا نقطہ نظر ہے۔ یہ نظریہ اس بات پر مرکوز ہے کہ احساس اور سوچ ایک دوسرے پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ادبی یا تخلیقی تنقید کا میدان، تخلیق، تخلیق کار اور تخلیق کے قاری کے مقابل امکانات کا ایک لامتناہی سلسلہ پیش کرتا ہے جس کی حد انفرادی ادراک کی تجسیم ٹھہرتی ہے۔ ادراکی تنقید سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ادراک کیا ہے اور اس کی تشکیل یا اس تک رسائی کب اور کیسے ممکن ہوتی ہے۔ ادراک، معنوی سطح پر پانا، دریافت، درک،

عقل، سمجھ، پہنچ، رسائی ، فہم (فرہنگِ آصفیہ: 137): غیر محسوس چیزوں کا دریافت کرنا، عقل، فہم، رشک (نور اللغات:254): ہوش، بوجھ، پوچھنا، پکنا (فرہنگ عامرہ:23): پانا، دریافت کرنا، عقل، فہم، رسائی (فیروز اللغات:79): ادراک، احساس، تمیز (فرہنگِ ادبی اصطلاحات:148): تفہیمی سطح پر فکروشعور کی تعاملیت ہے جو فکری، استدلالی اور تعبیراتی مزاج رکھتی ہے (کولنز:263): شعور و استدلال کا باہمی عمل جو نتیجہ خیز بھی ہو: چیزوں یا لفظوں کو جاننے، سیکھنے اور سمجھنے کی شعوری کوشش (میریم ویبسٹر: 501): ادرکی استدلال کی اساس خیال، مرکزیت، اور انفرادی طرزِ تعامل ہوتی ہے جو تخلیق اور تنقید کے درمیان تعلق کی نوعیت کو متنوع الزاویہ تفہیم دان کرتی ہے (کیمبرج:170)۔

فرحت عباس شاہ، ادراک کی درجہ بندی کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"ادراک کو نوعیت کے اعتبار سے تین درجوں: انفرادی، گروہی اور اجتماعی ادراک میں جب کہ ماہیت کے اعتبار سے دو سطحوں باطنی اور خارجی پر سمجھنے کی کوشش ادراک کی مزید پرتیں کھولنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔"(17)

نِک بریزبے (Nick Bralsby)، ادراک کو نفسیات سے جوڑتے ہوئے لکھتی ہے:

"ادراک کی نوعیت، ایک گہری فکری استدلال کی ہے جو متنوع، عقلی اور مدلل استفسارات کو جنم دیتی ہے جو عمومیت سے دور انفرادیت اور فکری تشریحات کا معاملہ ہوتا ہے۔"(18)

جان ڈی ہوور (Jan De Houwer)، لکھتے ہیں:

"ادراک کی اصلیت، تخلیق کی فکری و شعوری ساختمانیت یعنی کیوں اور کیسے کو بیان کرنے کے لیے ثلاثیت کا کردار نبھانا ہوتی ہے۔"(19)

اِدراک، اگر خیال، فہم اور شعور کی تعاملیت کا حاصل ہے تو ادراکی تنقید، احساس کی تشریح سے جنم لینے والا ایک علمی، عقلی اور فکری تاثر ہے جو منطقی استدلال کی خصوصیت رکھتا ہے جب کہ ادبی صورتوں میں اس سے مراد وہ فکری و شعوری کوشش ہے جو "سینسوریم" (Sensorium) کے اندر کسی احساس کی کروٹ سے جنم لیتی ہے۔ ادراک کا تصور علمی تفہیمات سے تعلق رکھتا ہے جس کے ذریعے ایک باشعور شخص یا ذہن خود خیالات یا احساسات کو سمجھتا اور ان کی ترجمانی کرتا ہے۔

فرحت عباس شاہ، ادرا کی تنقید کی تعریف و تفہیم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"باطنی اور خارجی عناصر کا اپنا اپنا ڈی این اے ہوتا ہے۔ ادرا کی تنقید اس ڈی این اے تک رسائی اور اس کے متعلق اس تجزیے کو ممکن بناتی ہے جس کے بعد نہ صرف کسی تخلیقی کام کا ادراک آسان ہو جاتا ہے بلکہ اس پر نقد و نظر کی سمت بھی درست رہتی ہے اور اسے منتقل کرنا بھی مشکل نہیں رہتا۔" (20)

مائیکل برک (Michael Burke) لکھتا ہے:

"ادراک، علمی ادبی مطالعات میں ذہنی تجربات کی تصویر کشی کے طور پر کھلتا ہے جو ایک تہذیبی و ثقافتی رجحان یا میلان سے بڑھ کر انفرادی تشکیل کا معاملہ بیان کرتا ہے۔" (21)

فرحت عباس شاہ، ادرا کی تنقید کا بنیادی مقصد لکھتے ہیں:

"ادرا کی تنقید کا بنیادی مقصد فکری استحصال کرنے والی تھیوریوں کو رد کر کے تخلیقی سچائی کا دفاع کرنا، حریتِ فکر اور تخلیقی عمل کی آزادی کی حوصلہ افزائی کرنا، احساس تنہائی سے نجات دلانا اور تجزیاتی فکر کو تقویت دے کر اس کی حفاظت کرنا ہے۔" (22)

ادرا کی تنقید، تخلیق اور تنقید کے درمیان تعلق کی ایک شعوری کھوج کے طور پر سامنے آتی ہے، جو تنقیدی ترجیحات کی ایک بھرپور ٹیپسٹری (Tapestry) کے طور پر اظہار اور ادراک کے درمیان درست سمت کا تعین کرتی ہے۔ تنقیدی اظہاریے کا یہ انداز، ایک ادبی "چیاروسکورو" (Chiaroscuro) جیسا ہے، جس کا مقصد تخلیقی مبہمات کو آشکار کرنا اور ایک نئی زندگی عطا کرنا ہے۔ ادرا کی تنقید بنیادی طور پر تخلیق کے داخلی دائرے میں داخل ہوتی ہے، ذہنی منظر کشی اور امیجز کے پیچیدہ اور متنوع دائروں کے درمیان معلوم سے نامعلوم اور نامعلوم سے نئے معلوم کی سمت سفر کا آغاز کرتی ہے۔ ادبی تنقید میں روایتی نقطہ نظر کے برعکس، یہ خاص طریقہ داخلیت اور موضوعیت کے تناظرات میں آتا ہے جہاں تنقید کا عمل غیر فعالیت سے پُر جوش و بھرپور فعالیت کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ادرا کی تنقید کی فعالیت، تخلیقی معاونت کا کردار بھی بطریقِ احسن نبھاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ (5)

ادرا کی تنقید، کیوں کر تخلیقی شعریت کی تفہیم و تجسیم کا معاملہ نمٹاتی ہے! ادرا کی تنقید، ایک متحرک اور کثیر جہتی صنف ہے، جو تخیلاتی مسافرت، تخلیقی کشف، لسانی اختراعیت اور جذباتی تموج کی باہمی وارفتگی سے بُنی ہوئی ہے۔ بنیادی طور پر، ادرا کی تنقید ایک عمیق

باطنی اور خارجی عناصر کی تعاملیت کا حاصل ہے، جو تخلیقی جذبات، احساسات، اور مشاہدات کو ایک مخصوص ندرت اور مستند و تازہ پیرہن فراہم کرنے کے لیے اظہاری منہج فراہم کرتی ہے۔ تخلیقی شعریت کے تعاملات کی تہہ داریوں کو انفرادیت کا قالب عطا کرتی ہے جہاں دیگر تخلیقی آلاتی مشغولیت، تخیل و تشکیل، علامت و ابہام، لفظ و معانی کے اختراعی ڈھانچوں اور صوتیاتی آہنگ و سنگم کو جانچنے اور نبیڑنے میں فعال کردار نبھاتی ہے۔

ادرا کی تنقید کے وصفِ اولین کا اظہاریہ کچھ ایسی صورت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے:

"تخلیقی عمل میں جس طرح کوئی بھی تخلیق کار بطور ایک فرد اپنے انفرادی ادراک کا مظاہرہ کرتا ہے اسی طرح اسے دیکھنے سننے اور پڑھنے والا اپنے انفرادی ادراک کی روشنی میں اس سے حظ اٹھاتا ہے یا نہیں اٹھاتا۔ "(23)

رومن انگارڈن (Roman Ingarden)، لکھتا ہے:

"ادراک کا عمل، ہر ایک جمالیاتی عنصر کے ذاتی مشاہدہ سے جنم لیتا ہے، جو حاصل تخلیقی تشریحات کی ترسیل میں سہولت فراہم کرتا ہے۔"(24)

فرحت عباس شاہ، حظ کا معاملہ تخلیقی ادراک اور اظہاریے سے جوڑتے ہوئے لکھتے ہیں:

"تخلیق کار کا تخلیقی ادراک اور اظہار جتنا ذاتی یا آفاقی ہوگا اپنے خارج میں وہ اتنا ہی ذاتی یا آفاقی سطح پر قبولیت پائے گا۔(25)

ادرا کی تنقید، تخلیقی شعریت کی تفہیم و تجسیم کا معاملہ بطریقِ احسن نبیڑتی دکھائی دیتی ہے۔ اول اول مشرقی و مغربی تخلیق و تنقید کے بیچ موجود لکیر کو مدہم و مدغم کرنے کی کوشش کے بجائے ایک واضح اور مدلل بیانیہ سے نبیڑنے کی مضبوط و محفوظ صورت، ایک عملی صورت کا پیش نامہ لکھتی ہے۔ اردو ادبی اصناف میں بیشتر کا حوالہ مغربی ادبی روایت سے جوڑا جاسکتا ہے لیکن یہ حوالہ چاہے آخری حوالہ بھی ہو پھر بھی درست نہیں ہے۔ اردو ادب میں نثر و شاعری کی تخلیقی شعریت کا معاملہ مشرقی سانچے اور برتاؤ کا متقاضی ہے جو ایک علمی و ادبی ضرورت کے ساتھ تخلیقی استحقاق کا معاملہ بھی ٹھہرتا ہے۔ غزل کی شعریت تو کجا سرنامہِ صنف کا بدل بھی مغربی شعری روایت میں ڈھونڈ لینا مشکل ہو جاتا ہے، دوسری جانب شعری قالب کی بُنت کی خوبصورتی کے ساتھ مشرقی لحن و آہنگ کی تاثیر بھی اسی زمین کا خاصہ ٹھہرتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو ادب کے بیشتر تنقیدی معیارات، رجحانات یا دبستان تخلیق کی براہ راست پرکھ کے لیے نہیں بنائے گئے بلکہ پہلے سے

موجود نظریات کی اثر پذیری اور معاونت کی ضرورت کا حاصل ہوئے ہیں جب کہ ادراکی تنقید کا مقصد تخلیق و تنقید کی براہ راست معاونت ہے۔ اس کی ایک وجہ ادراک کی کلیت کی حامل خصوصیت ہے جو علم وفن تک محدود نہیں بلکہ تہذیب و معاشرت کی پرکھ کا حوالہ بھی ہے کیوں کہ ادراکی تنقید، تخلیق کو تخلیقی جواز کے آئینے میں دیکھتی ہے۔ ادراکی تنقید کا ایک اور اہم نکتہ اصلی و نقلی ادب، تخلیق اور تنقید یا حقیقی و مصنوعی ادب، تخلیق اور تنقید کے درمیان موجود خطِ فاصل کی نشاندہی کرنا اور ادبی، تخلیقی و تنقیدی معاونت کے معاملہ کو نبیڑنا بھی ہے۔ ادراکی تنقید، انفرادی، گروہی اور اجتماعی ترجیحات کی سمت متعین کرتی ہے جس کا مقصد مذکور کی اپنی اپنی سطح پر موجود ساکھ کا پرتو پیش کرنا ہے۔ لہٰذا جب تک نقلی و اصلی یا حقیقی و مصنوعی کی حدِ فاصل کا تعین نہیں ہوگا، مذکور کا حاصل بھی نشانِ زد رہے گا۔ ادراکی تنقید کا ایک اہم کام فکشن کی تخلیقیت کو مشرقی معیارات کے درمیان رکھ کر کھولنے کی کوشش ہے جو اردو نثر کی تخلیقیت کا معاملہ نبیڑتی ہے۔ ناول و افسانہ کی تخلیقیت کی کھوج کا ادراکی معاملہ روایت سے موجود تک کے چنیدہ حوالوں کو ادراکیت کی تفہیم و تجسیم تک نبھاتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

(1) احمد، کلیم الدین، 1967، سخن ہائے گفتنی، پٹنہ، کتاب منزل سبزی باغ، ص۔ 251

(2) فلسکی، ریٹا، 2008، Uses of Literature، آکسفورڈ، بلیک ویل پبلشنگ لمیٹڈ، ص۔ 21

(3) حسین، سید احتشام، 2009، تنقیدی نظریات، جلد اول، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ص۔ 15

(4) ایگلٹن، ٹیری، 2005، The Function of Criticism، لندن، ورسو بکس پبلشنگ کمپنی، ص۔ 17

(5) نارتھ، جوزف، 2017، Literary Criticism: A Concise Political History، لندن، ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ص۔ 44

(6) آل احمد سرور، 2009، تنقید کیا ہے؟، مشمولہ: تنقیدی نظریات، مرتب: سید احتشام حسین، جلد اول، لکھنؤ، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ص۔ 173

(7) زور، سید محی الدین قادری، 1960، روحِ تنقید، لاہور، مکتبہ معین الادب، ص۔ 75

(8) کول، لیجو، 2016، Known and strange things : essays، نیویارک، رینڈم ہاؤس، ص۔ 175

(9) اسمتھ، زیڈی، 2009،

Changing My Mind: Occasional Essays، لندن، پینگوئن گروپ، ص-67
(10) نقوی، نورالحسن، 1990، فن تنقید اور اردو تنقید نگاری، علی گڑھ، ایجوکیشنل بک ہاؤس، ص-7
(11) ایلیٹ، ٹی ایس، 1986، The Use of Poetry and the Use of Criticism، فیبر اینڈ فیبر لمیٹڈ، لندن، ص-12
(12) اختر، ڈاکٹر سلیم، 1997، تنقیدی دبستان، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص-15
(13) برٹنز، ہنس، 2014، Literary Theory: The Basics، لندن، روٹلیج، ص-1
(14) حسین، سید احتشام، 2013، ادبی تنقید کے مسائل، مشمولہ: تنقید کی جمالیات، مرتبہ: عتیق اللہ، جلد:1، دہلی، کتاب دنیا، ص-357
(15) اپسٹون، سارا، 2017، Literary Theory: A Complete Introduction لندن، انگلش یونیورسٹیز پریس، ص-7
(16) شاہ، فرحت عباس، 2023، اردو کا ادرا کی تنقیدی دبستان، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ص-30
(17) ایضاً، ص-33
(18) بریزبے، بک، Cognitive Psychology، 2012، آکسفورڈ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص-3
(19) ہوور، جان ڈی، 2020، The Psychology of Learning، لندن، ایم آئی ٹی پریس، ص-17
(20) شاہ، فرحت عباس، 2023، اردو کا ادرا کی تنقیدی دبستان، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ص-32
(21) برک، مائیکل، 2017، Cognitive Literary Science، آکسفورڈ، بلیک ویل پبلشنگ لمیٹڈ، ص-28
(22) شاہ، فرحت عباس، 2023، اردو کا ادرا کی تنقیدی دبستان، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ص-31
(23) ایضاً، ص-34
(24) انگارڈن، رومن، 1973، Cognition of the Literary Work of Art، ایوسٹن، نارتھ ویسٹرن یونیورسٹی پریس، ص-177
(25) شاہ، فرحت عباس، 2023، اردو کا ادرا کی تنقیدی دبستان، کراچی، رنگِ ادب پبلی کیشنز، ص-34

☆☆☆☆☆

خزاں کا آدمی ___ شہزاد اظہر

مجھے شہزاد اظہر کی غیر مطبوعہ تخلیقات پر مبنی کتاب ''خزاں کا آدمی'' موصول ہوئی۔ اس کتاب کو مہناز انجم اور فرزند علی ہاشمی نے شہزاد کے انتقال کے بعد مدوّن کیا ہے۔ بجا طور پر ان دونوں شخصیات کی تحسین واجب ہے کہ انھوں نے نہایت محنت سے شہزاد اظہر کے بکھرے ہوئے کام کو یک جا کیا اور اسے طباعتی شکل دی۔ ورنہ شہزاد اظہر کی یہ وقیع تخلیقات ضائع ہو جاتیں یا کسی کے بستے چڑھ جاتیں اور پھر ان تخلیقات کے ساتھ وہی ہوتا جو ادبی دنیا کے سرقہ پسند لوگ کیا کرتے ہیں۔ مہناز انجم اور فرزند علی ہاشمی نے شہزاد کی ڈائریوں سے اور اس کے کتب خانے سے شذرات کی شکل میں موجود تخلیقی مواد کو بہت محنت سے اکٹھا کیا۔ یہ کام وقت صرف کرنے والا اور جان کھپا دینے والا تھا، مزید برآں یہ کہ بغیر لگن کے ممکن نہیں تھا۔ اس کتاب کو مرتب کرنے سے شہزاد اظہر کی علمی کاوشیں تو سامنے آئی ہی ہیں، مہناز انجم اور فرزند علی ہاشمی کا مرتبہ بھی بلند ہوا ہے کہ انھوں نے شہزاد اظہر سے اپنی گہری دوستانہ وابستگی کا ثبوت دیا۔ ورنہ یہ ہمارا روزانہ کا مشاہدہ ہے کہ مرنے والے کو لوگ اس طرح فراموش کر دیتے ہیں، جیسے وہ کبھی ان کے درمیان تھا ہی نہیں۔ مگر ان دونوں علم دوستوں نے نہ صرف بیاری کے عالم میں شہزاد اظہر کی ڈھارس بندھائی بل کہ اس کے تخلیقی کام کو منصۂ شہود پر لا کر شعر و ادب سے وابستہ لوگوں پر بڑا احسان کیا ہے۔ کتاب میں شہزاد اظہر کا غیر مطبوعہ کلام، تنقیدی مضامین، تراجم اور اس کے فکر و فن پر شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے معاصر اور معروف لوگوں کی آرا شامل کی گئی ہیں۔

شہزاد اظہر سے میرے بھی دوستانہ مراسم تھے۔ حلقہ ارباب ذوق راول پنڈی کے اجلاسوں میں اس سے متعدد بار ملاقات ہوئی۔ اس کے علاوہ کئی ادبی تقاریب میں

طالب انصاری

بھی اس کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔ ان ملاقاتوں کے توسط سے مجھ پر شہزاد اظہر کے تخلیقی جہان کی کئی سمتیں کھلیں۔ وہ فکر نو رکھنے والا شاعر ہونے کے ساتھ بہترین ناقد اور مترجم بھی تھا۔ انگریزی ادبیات کا وسیع مطالعہ رکھتا تھا۔ تنقیدی اجلاسوں میں شہزاد اظہر کی موجودگی سیر حاصل بحث کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ راول پنڈی کی ادبی بیٹھکیں اس کے دم سے آباد تھیں۔

وائے افسوس کہ اسے ایسی بیماری نے آلیا، جس نے اسے جسمانی طور پر مفلوج کر کے رکھ دیا۔ زبان میں لکنت در آئی۔ ایک اندازے کے مطابق ابھی تو اس نے بہار و خزاں کے پچاس دورانیے ہی دیکھے ہوں گے کہ ایسی سمت میں جا نکلا جو زندہ لوگوں کے لیے ہمیشہ سے ایک معمہ رہی ہے۔ وہ ہوائے بہار آفریں کا ایسا تند و تیز جھونکا تھا، جو مختصر وقت میں چمنِ ادب کو ہرا بھرا کر گیا۔ بیماری کے عالم میں بھی اس نے لکھنا نہیں چھوڑا۔ البتہ ادبی محافل میں آنا ترک کر دیا تھا۔ وہ جسمانی طور پر معذور ہوا تھا، ذہنی طور پر مفلوج نہیں ہوا تھا

ایک روز اس نے مجھے فون کیا۔ کہنے لگا:

پتا چلا ہے تمہارے واہ میں بہت اچھا ہومیو ڈاکٹر ہے۔ میں انگریزی علاج سے مایوس ہو چکا ہوں۔ سوچتا ہوں کہ ہومیو علاج کو بھی آزمالوں میں نے اسے اپل ہسپتال کا محل وقوع بتایا کہ مذکورہ ہومیو ڈاکٹر اسی ہسپتال سے منسلک ہے۔ پھر پتا چلا کہ شہزاد اظہر واہ میں آیا تھا، مگر بہت عجلت میں تھا۔ مجھے ملے بغیر ہی چلا گیا۔ بیماری کے دوران ہی اس کی دو کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ایک غزلیہ مجموعہ "لہو کے ریشم سے" اور ایک نظموں پر مشتمل مجموعہ "پل کی سلوٹ پر"۔ شاید شہزاد اظہر کو احساس ہو چلا تھا کہ اب گنتی کی سانسیں رہ گئی ہیں۔ اسے اپنے تخلیقی کام کو طبع کروا کر محفوظ کر لینا چاہیے۔

اس کی غزلوں کی کتاب کی تقریب پذیرائی اکادمی ادبیات کے دفتر میں ہوئی۔ وہ فالج کی ایسی حالت میں تھا کہ اس کا کہا سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ زبان لڑکھڑا جاتی تھی۔ شہزاد اظہر کا ہی ایک شعر اس کیفیت کو بیان کرتا ہے

تم ہی نہیں ہو لکنتِ لفظی کے بیچ میں
ضعفِ زباں کے پھیر میں آیا تو میں بھی ہوں

مگر وہ اپنی دُھن میں دھیرے دھیرے بولتا جاتا تھا۔ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ جانے اس کے درون میں کیسا کرب تھا، جو اس کی زبان پر تو آتا تھا، مگر اظہار کی سطح تک آنے سے قاصر تھا۔ سب اس کے چہرے پر کرب

کی گہری ہوتی پرچھائیاں دیکھتے تھے اور کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ شہزاد اظہر کرب کی ان پرچھائیوں سے آزاد ہو گیا ہے۔

مگر شہزاد اظہر اپنے تخلیقی تفاعل کے انفراد سے اپنی الگ شناخت چھوڑ گیا ہے۔ وہ الفاظ اور تراکیب کو تہہ دار معنویت کے رس میں گوندھ کر استعمال کرنے کا ہنر جانتا تھا۔ وہ ایک ہی طرح کی تراکیب اور الفاظ، جنھیں پامال راستہ کہیں تو مناسب رہے گا، پر چلنا پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے فکری اور اسلوبی رویے میں شکیب جلالی کے اس شعر کی مثال تھا:

شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے
ہم اس سے بچ کے چلتے ہیں، جو رستا عام ہو جائے

....

اسی وجہ سے اس کی لفظیات، تراکیب اور ان کا معنویاتی رنگ متاثر کیے بغیر نہیں رہتا تھا۔ نظم ہو، غزل ہو یا انتقادی نثر، ہر تین اطراف میں اس کی جولانیٔ فکر کے پرچم لہراتے تھے۔

شہزاد اظہر کے کچھ منتخب اشعار جو ""خزاں کا آدمی"" میں شامل ہیں، اس کی شعری فکریات کو سمجھنے میں معاون ہیں۔ ان اشعار میں بیشتر وہ اشعار ہیں، جو اس نے بیماری کی حالت میں لکھے:

اپنی بے کاری، اعضا پہ بھی رشک آنے لگا
اک اپاہج کے لیے اتنی محبت مرے دوست

انگلیاں اس کے تقرب سے ہری ہونے لگیں
آکسیجن کی طرح پہنچا قلم میرے لیے

عشق رنجِ مستقل ہے سر بسر مشکل میں ہوں
وہ ادھر مشکل میں ہے اور میں ادھر مشکل میں ہوں

میں اپنی موج میں خود کو میسر کیوں نہیں آیا
سمندر کی طرف چل کر سمندر کیوں نہیں آیا

محاذِ عشق سے پسپائی خوش آئی نہیں مجھ کو
میں بچ کر آ گیا شہزاد، مر کر کیوں نہیں آیا

کھل نہیں پائے کسی شے کے معانی یعنی
ہم ہر اثبات پہ کہتے رہے یعنی یعنی

تیز ہوا میں اڑتا پھرتا کوئی نشاں رہ جاتا ہے
دیا بجھانا کھیل نہیں ہے اس کا دھواں رہ جاتا ہے

موتیے کے پھول اتنے فریم پر ڈالے گئے
ہنسنا مشکل ہو گیا دیوار پہ تصویر کا

کسی تھوڑی کے نیچے تل کی مشعل جل رہی تھی
زماں کی رتھ اسی جگنو کی لو میں چل رہی تھی

تنہائی سے اٹا ہوا لمحہ تو میں بھی ہوں
اس گردِ بے شمار سے لپٹا تو میں بھی ہوں

اے دن ترے بدن پہ مری دھوپ بھی تو ہے
اے شب تری جبیں پہ چمکتا تو میں بھی ہوں

.....

شہزاد اظہر کی ایک نظم بھی ملاحظہ فرمائیے، جو اس کے اس احساس پر مبنی ہے کہ اب اس کے دن تھوڑے رہ گئے ہیں:

بتا رہا ہوں
مجھ سے
اس پل کی دھڑکتی
دھوپ چھاؤں میں ملو
اگلے پل کی روشنی کی رو میں
جانے کون ہو
میں تو نہیں ------
تم بھی نہیں ------
خوابوں کے ریوڑ ہیں بس
نیلی پیلی بکریاں ہیں
اور نئی ساعت کی گھاس ---
قہقہوں اور پیالیوں کی کھنکھناہٹ
نوبہ نو میزیں بدلتی جائے گی
مقفلوں میں تازہ دم سلگے کی آگ
ہاتھ وہ تاپیں گے
جن کے سبز بھاگ ----
آنے والے پل کی تمثالوں میں
تم اور میں نہیں -----
مجھ سے
اس پل کی دھڑکتی
دھوپ چھاؤں میں ملو

.....

اس بے پناہ دکھ کو اندازہ لگانا ہی مشکل ہے کہ تخلیقیت سے بھرا ہوا انسان، جسے اپنے اس ہنر کا ادراک بھی ہو، اور وہ اپنے ہونے کا احساس بھی دلاتا ہو، لمحہ بہ لمحہ نہ ہونے کی منزل پر چلا جا رہا ہو۔ وہ بیماری کے ہاتھوں خزاں رسیدہ ہو کر بھی اپنے ہرے بھرے ہونے کا اعلان کرتا رہا۔

''خزاں کا آدمی'' لائقِ مطالعہ کتاب ہے اور میں اسے ادبی اثاثے میں ایک بہترین اضافہ سمجھتا ہوں۔ اس کتاب کے مطالعے سے قاری نہ صرف شہزاد اظہر کی شاعری سے متعارف ہوتا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کی نقد و نظر اور ترجمہ کی خوبیوں سے بھی واقف ہوتا ہے۔ ایک ہی کتاب میں شہزاد اظہر کی کثیر الجہاتی ادبی تخلیقات کا اجتماع مستقبل کے قاری کو شہزاد اظہر کے تمام ادبی کاموں سے آشنا رکھے گا۔

☆☆☆☆☆

رانا محمد شاہد کی شاہکار کتاب ''شہابِ فکر''

اردو ادب کے دامن میں بڑی وسعت پائی جاتی ہے۔ صحافتی، علمی، ادبی، معاشی، سماجی، اخلاقی، سیاسی اور اسی نوعیت کے موضوعات ادبی دنیا میں شامل ہیں۔ کالم نویسی اور مضمون نویسی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ کالم اور مضمون میں فرق ہے۔ کالم اور فیچر کی دنیا بھی مختلف ہے۔ رانا محمد شاہد صحافتی دنیا کے علاوہ ادب میں بھی اپنا مقام رکھتے ہیں۔ کالم اور مضامین لکھنے والے لوگ حساس طبیعت کے حامل ہوتے ہیں۔ معاشرے میں وہ عدم استحکام، عدم مساوات اور عدم انصاف کے خلاف علم بغاوت کرنے والوں میں ایسے ہی شہاب فکر صفِ اول میں موجود ہوتے ہیں۔ کلمہ حق بلند کرنا مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں ہے۔ رانا محمد شاہد کا تعلق بھی اسی برادری سے ہے جو سچ اور حق کی آواز بلند کرتے ہیں۔ ان کے کالموں اور مضامین پر مشتمل مجموعہ ''شہاب فکر'' شائع ہوا ہے۔ بنیادی طور پر ان کا یہ دوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل ان کے مضامین اور کالموں کا ایک مجموعہ ''طناب فکر'' کے نام سے منصۂ شہود پر آچکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب حسن ادب فیصل آباد نے شائع کی ہے جو جنوری 2024 کو منظرِ عام پر آئی۔ اس کے 180 صفحات اور قیمت 1000 روپیہ رکھی گئی ہے۔ اس کتاب پر ڈاکٹر طاہر مسعود، احمد حاطب صدیقی، افضل پارس، شبیر ابن عادل کی آرا شامل ہیں۔ جب کہ رانا محمد شاہد کی اپنی بات اُن کی لفظی رام کہانی ہے۔

کالموں اور مضامین میں ''1- نیا سال اور ہمارے رویے ☆2- انصاف یہ ہوتا ہے ☆3- ''میرا جسم میری مرضی'' کے نتائج ☆4- کہیں ملے تو پلٹ کر نہ دیکھنا اس کو ☆5- کم جوان دی موت اے ☆6- ارطغرل کی خوبصورتی۔۔۔ اس کے کردار اور مکالمے ☆7- بچپن کی سحری اور افطاری ☆8- بچپن کی بچی، سادہ اور بے ریا عیدیں ☆9- ''ماہ میر'' ایک کلاسیک آرٹ فلم ☆10- ٹیکس کے بغیر سہولتیں۔۔ محض خواب ☆11- گیسٹ ہاؤس۔۔۔ بھولے بسرے دن

ہارون الرشید تبسم

☆-12 سانحہ جلیانوالا باغ اور ہندوستانیوں کی تذلیل ☆-13 سردی کی لہر اور سردی کی سوغاتیں ☆-14 بچپن کا رومانس--- نیلام گھر ☆-15 عالم ہو کر بھی خاص ہے- "آم" ☆-16 مون سون کی بارشیں اور ہمارا گلا سڑا نظام ☆-17 یادیں----1992 کا ورلڈ کپ ☆-18 امیر المومنین! آپ کے سپاہی جیت گئے ہیں ☆-19 موت اور انسانی بے بسی ☆-20 سیرت مبارکہ اور شان مصطفیٰ ☆-21 ایک روحانی سفر اور موئے مبارک کی زیارت ☆-22 قوت ایمانی کا کرشمہ ☆-23 ایک ہاتھ میں ایٹم بم، دوسرے میں کاسۂ گدائی ☆-24 آٹے کے لیے ذلیل ہوتی عوامی اور حکمران ☆-25 امی جی--- "گھیر لیتی ہیں مجھے کتنی ہی یادیں تیری" ☆-26 میزبان اور مہمان---- تہذیب و شائستگی" شامل ہیں-

رانا محمد شاہد کا تعلق بورے والا سے ہے-وہ بچپن سے ہی قلم و قرطاس سے رشتہ استوار کیے ہوئے ہیں- بہت دیر تک بچوں کے رسالے "آنکھ مچولی" میں چھپتے رہے- "آنکھ مچولی" کے مدیر ڈاکٹر طاہر مسعود تھے- جب رانا محمد شاہد اپنا دوسرا مجموعہ لانے لگے تو انھوں نے خیال کیا کہ ڈاکٹر طاہر مسعود سے پیش لفظ لکھوایا جائے- لہٰذا ڈاکٹر طاہر مسعود نے بھی بڑی محبت سے اس مجموعے کا پیش لفظ لکھا ہے-وہ رقم طراز ہیں:

"سارے کالم متفرق اور متنوع موضوعات پہ ہیں، گویا کتاب میں موضوعات و مسائل کے اعتبار سے بڑی رنگا رنگی پائی جاتی ہے- جہاں اس میں بچپن کی یادیں ہیں تو وہیں سماج کے بعض سنگین مسائل بھی ہیں، خصوصاً معاشرے کے اخلاقی زوال کے بارے میں شاہد صاحب نے اعداد و شمار اور تحقیق سے جن حقائق کی طرف اشارے کیے ہیں، وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں- ساتھ ہی ساتھ انھوں نے بعض فلموں اور ڈراموں کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور نہایت ایمانداری سے ان پر تبصرے کیے ہیں- ان کالموں کے مطالعہ سے میری معلومات میں بہت اضافہ ہوا- صحافت کے مقاصد میں ایک مقصد اطلاعات کی فراہمی اور دوسرا مقصد تعلیم دہی ہے- شاہد صاحب کے کالم ان دونوں مقاصد پر پورے اترتے ہیں-"

کالم ایک ایسی صنف ہے جس میں موضوعات کا تنوع ملتا ہے اور لکھنے والا اسے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے لکھتا ہے- جب کوئی واقعہ رونما ہو جاتا ہے تو اس کے فوراً بعد لکھنے والا صحافیانہ انداز اپناتا ہے جب کہ تھوڑے عرصہ کے بعد لکھنے والا اس میں ادبی رنگ اور چاشنی بھی پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے - رانا محمد شاہد کا تعلق دوسرے قبیلے سے ہے-وہ واقعات کو دیکھتے ہیں اور اسے ذہن کی بھٹی میں کندن بننے دیتے ہیں جب کچھ عرصہ کے بعد وہ واقعہ صفحہ قرطاس پر نمودار ہوتا ہے تو وہ ایک فن پارہ بن چکا ہوتا ہے- وہ مشہور زمانہ ڈرامہ

"ارطغرل غازی" کے حوالے سے بھی قلم اٹھاتے ہیں۔ اس میں قارئین کو جھنجھوڑنے اور انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنے کے کئی پیغامات موجود ہیں۔ رانا محمد شاہد نے چند مکالمات کو بطور خاص درج کیا ہے۔

"جو قوم خواب نہیں دیکھتی، وہ کچھ پاتی بھی نہیں"

"انسان کی فطرت ہے کہ وہ طاقت کی اطاعت کرتا ہے"

"آزادی اور امن باتوں اور دعوؤں سے نہیں تلواروں سے حاصل ہوتے ہیں۔"

"ہم خیانت اور دھوکا دہی سے کامیابی حاصل کرنے پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔"

"اسلاف کی داستانیں بچوں کو سلانے کے لیے نہیں؛ مردوں کو جگانے کے لیے سنائی جاتی ہیں۔"

یہ وہ جملے ہیں کسی حساس دل رکھنے والے کو پوری طرح بیدار کر سکتے ہیں۔ رانا محمد شاہد نے اس ڈرامے کو نہایت غور اور سنجیدگی سے دیکھا اور اپنے اندر جذب کیا ہے۔ یہ بات ان کے کالم سے صاف دکھائی دیتی ہے۔ احمد حاطب صدیقی نے ان کی کتاب کے حوالے سے لکھا ہے:

"اپنے کالموں اور مضامین میں رانا محمد شاہد نے سیاسی وسماجی موضوعات کے ساتھ ساتھ کچھ کچھ ادبی انداز کی تحریریں بھی شامل کی ہیں۔ ان تحریروں کے عنوانات بھی ادبی انداز لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً ایک ڈرامے پر نقد ونظر کرتے ہوئے انھوں نے جو مضمون لکھا اس کا عنوان ہے "کہیں ملے تو پلٹ کر نہ دیکھنا اس کو"۔ انھوں نے "بچپن کی سحری وافطاری" کی یادیں بھی تازہ کی ہیں اور "بچپن کی سادہ، سچی اور بے ریا عیدیں" بھی ان کے حافظے میں محفوظ ہیں۔ ان کے "بچپن کا رومانس۔ نیلام گھر" بھی ان کی بھولی بسری یادوں کا موضوع بنا ہے۔۔۔ رانا محمد شاہد کے کالموں اور مضامین کا یہ مجموعہ بھی ایک لاجواب تحفہ ہے۔ اس کم عمری میں ان کے کالموں کا مجموعہ آجانا قابلِ مبارک باد ہے۔"

رانا محمد شاہد کی تحریریں پڑھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بے حد حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ وہ معاشرے میں ہونے والے واقعات، حادثات اور سانحات کو دیکھ کر کس قدر دکھی، افسردہ اور رنجیدہ ہو جاتے ہیں اور یہی حال ان کے قلم کا ہے۔ وہ دل کا زہر کاغذ پر بکھیر دیتے ہیں ایک اچھا ادیب معاشرے کا بہترین عکاس ہوتا ہے۔ رانا محمد شاہد بھی اپنے معاشرے کے عکاس ہیں۔ وہ وہی کچھ پیش کر رہے ہیں جو کچھ ہمارا معاشرہ انہیں دے رہا ہے۔ افضل پارس ان کے مضامین اور کالموں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"ان کا دوسرا مجموعہ کالم ومضامین "شہاب فکر" کے نام سے عنقریب اشاعت کے مرحلے سے گزرنے والا ہے۔ کچھ کالم اور مضامین میری نظر سے گزرے ہیں۔ رانا شاہد اپنے ہنر سے انصاف کرنا جانتے ہیں۔ ان کی نثر میں روانی، مصرعوں اور فقروں کا تسلسل قاری کے لیے نئے جہانوں کے در کھولتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ حیرت اور یقین کا ماہر ہے انہیں پتا ہے کہ

کہاں پر محبوب کی زلفوں کے پیچ و خم میں پڑھنے والے کو متجسس کرنا ہے، آس اور امید کے در کب اور کہاں وا کرنے ہیں۔ انصاف اور عمل سے بھرپور نصیحت اور وصیت کی طرف کب اور کہاں قاری کو لے جانا ہے۔ سب سے بڑی بات رانا محمد شاہد قلم کی نوک سے معاشرے کی سرجری جس خوبصورت انداز سے کر رہے ہیں یہ ان کا خاصا ہے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ.....''

رانا محمد شاہد کی تحریر میں روانی اور ادبیت موجود ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر لکھنے سے پہلے اس پر خوب محنت اور عرق ریزی کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں بھرپور معلومات اکٹھی کرتے ہیں پھر اسے ادبی رنگ میں رنگتے ہوئے اور پھر اسے ادبی فن پارہ بنا دیتے ہیں یہی ان کا کمال ہے کہ وہ جب لکھتے ہیں تو اس میں رموز و اوقاف، صحتِ زبان، محاورات اشعار کا بروقت اور برمحل استعمال اس تحریر کو زمین سے اٹھا کر آسمانوں تک لے جاتی ہے۔ شبیر ابن عادل (سابق پروڈیوسر نیوز، پی ٹی وی) کی رائے بھی ملاحظہ ہو:

''ان کی تحریر پڑھتے وقت یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی مضمون نہیں بل کہ کوئی افسانہ اور کہانی پڑھ رہے ہوں۔ شروع سے آخر تک تحریر میں اتنی کشش ہوتی ہے کہ مکمل کیے بغیر درمیان سے چھوڑنے کا دل ہی نہیں چاہتا۔ خاص طور پر بچپن کی سحری و افطاری یا بچپن کی عیدیں ہوں۔ ان میں اتنی تفصیل سے سارا ماحول ہے کہ یوں لگتا ہے گویا ہم اپنے بچپن میں پہنچ گئے ہوں۔ وہی سحر و افطار کے وقت تمام اہل خانہ کا ایک ساتھ جمع ہونا، سحری کے وقت ڈھول لے کر جانے والوں کا خاص طور پر رمضان کے آخری عشرے میں آنا اور بہت ایسی باتیں جن کا ہم نے بھی کراچی جیسے شہر میں ان کا مشاہدہ کیا ہے۔ اسی طرح عیدین کے موقع پر بچوں کا نئے نئے کپڑے پہن کر گلیوں میں جا کر اپنی پسند کی چیزیں کھانا اور اونٹ کی سواری کرنا، اسی طرح کی معصوم باتوں کا ذکر رانا شاہد نے بورے والا کے حوالے سے کیا ہے۔''

رانا محمد شاہد ''شہاب فکر'' ماضی کی یادوں کو نہایت عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے حافظے میں ماضی کے نقوش ثبت ہیں وہ ان نقوش سے لفظی تصویر کشی کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں بلا کی روانی، سلاست اور رعنائی موجود ہے۔ وہ کسی بھی موضوع پر جب لکھتے ہیں تو اس میں خوبصورتی اور زیبائی پیدا کر دیتے ہیں۔ ''شہاب فکر'' ان کے کالموں اور مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ وہ ماضی کے جھروکوں میں جھانکنے والے ادیب ہیں۔ وہ اپنے جادۂ منزل کے لیے سارا اثاثہ ماضی سے حاصل کرتے ہیں۔ وہ لفظوں کے شاہد ہیں اور شہاب فکر کے گرد ہمہ وقت محوِ سفر ہیں۔ ان کی سوچ کا پنچھی تخلیق کی پگڈنڈیوں پر معلق رہتا ہے۔ انھیں لفظوں پر عبور حاصل ہے اور وہ بے ذائقہ لفظوں کو اپنی من پسند کا ذائقہ عطا کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

......ایک مقبولِ بارگاہِ خیر الانام نعت گو کا جہانِ فکر......

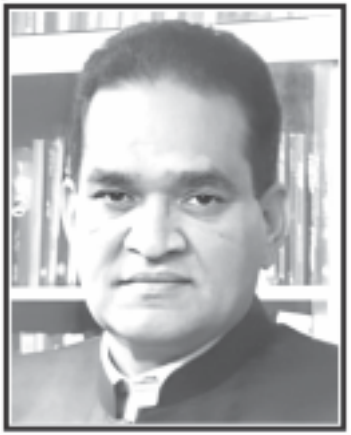

شوکت ہاشمی نے کہا تھا:

میں حرف و شعر کی خیرات دینے والا شخص
امیرِ شہر نے سمجھا فقیرِ راہ مجھے

....

اپنے حرف و شعر کو خیرات کرنے والا لبادۂ فقر میں جب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دلپذیر نقشیں ہوتا ہے تو اس کا جہانِ فکر جمالِ محمدی کی خوشبوؤں سے مہکنے اور سیرت سرورِ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنیوں سے جگمگانے لگتا ہے یہ وہی خوش کلام شاعر ہے جو ایک اعلیٰ پولیس افسر ہوتے ہوئے نسبت سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا خوش کن حوالہ ساتھ لیے عالمِ شباب میں اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوا............

اللہ پاک نے جوانی ہی میں شوکت ہاشمی کو ایک سعادت کے لیے منتخب کرلیا تھا اور وہ تھا ایک نعت گو کی شناخت کا حوالہ......اور اس متبرک حوالے نے اُن کے باطن میں رنگ و نور اور سرکارِ دو عالم سے عشق و محبت کے والہانہ پن کی کئی کہکشائیں روشن کر رکھی تھیں......

کبھی درود پڑھوں اور کبھی سلام کروں
درِ حضور پہ یوں زندگی تمام کروں

....

علی رضا

جمالِ سیرتِ احمد دکھاؤں دنیا کو
تمام عمر اِسی روشنی کو عام کروں

مرے حضور کے قدموں کو اس نے چوما ہے
میں کیوں نہ خاکِ مدینہ کا احترام کروں

.....

میری آنکھوں سے کبھی سوئے مدینہ دیکھو
نور ہی نور اُجالا ہی اُجالا دیکھو

وہ تو چھپتے ہی نہیں دیکھنے والوں سے کبھی
اُن کو آنکھوں سے نہیں دل سے زیادہ دیکھو

خاک پر سویا ہوا پیٹ پہ پتھر باندھے
سیر کرتا ہے سرِ عرشِ معلّٰی دیکھو

.....

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایۂ رحمت میں پناہ گزیں رہنے والا شوکت ہاشمی جب اپنے آقا و مولا سرورِ دو جہاں کے دربار گہر بار میں پیش ہوتا ہے تو فرطِ عقیدت سے پکار اُٹھتا ہے:

اس قدر آساں نہیں ہے نعت کہنے کا ہُنر
اِس ہُنر کو سایۂ اسمِ محمدؐ چاہیے

تجھ کو لکھنا ہے اگر نعتِ پیمبرؐ شوکت
آپ کا حسنِ عمل آپ کی سیرت لکھ دے

.....

جمالِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنیوں سے فیض پانے والا شوکت ہاشمی اپنی نعت میں روایتی انداز سے ہٹ کر بات کرنے کا قائل ہے تبھی تو اس کا جہانِ نعت انفرادیت اور خوش اسلوبی کی خوشبوؤں سے معطر اور عقیدت و مودّت کی چاشنی سے منور دکھائی دیتا ہے.....

شاخِ نور"، "سارے حرف گلاب"، "فیضانِ رحمت" اور "بہارِ طیب و طاہر" جیسے نعتیہ شعری مجموعہ ہائے کلام تخلیق کرنے والے شوکت ہاشمی کے قلم سے جب مدحتِ پیمبرؐ کے گلاب کھلتے ہیں تو اُس وقت اُن کے گلستانِ سخن کی بہار دیدنی ہوتی ہے.....

یہ بارگاہِ رسالتؐ ہے سوچ کر آنا
درود پڑھتے ہوئے اور بچشمِ تر آنا

یہاں جو آتے ہیں اِس حال ہی میں آتے ہیں
سو تم بھی عشقِ پیمبر میں ڈوب کر آنا

تجھے میں خاکِ مدینہ سے مُشکبار کروں
ہوائے گلشنِ ہستی ذرا اِدھر آنا

یہی تو اہلِ محبت کی شان ہے شوکت
کہ ذکرِ عشقِ پیمبر پہ آنکھ بھر آتا

....

شوکت ہاشمی نے رسمی نعت نگاری کی تقلید نہیں کی بلکہ انھوں نے سیرتِ سیدِ عالم اور کلامِ ربانی کے ساتھ ساتھ احادیثِ مبارکہ سے کسبِ نور کیا ہے اور اپنی نعتوں کے پاکیزہ ماحول کو سلسلۂ خیر و برکت بنا دیا ہے اُن کے نعتوں میں آپ کی سیرت کا بیان جس وارفتگی اور مختلف زاویوں سے ہوا ہے اس نے اُن کی فضائے نعت کو اور بھی دلنشیں بنا دیا ہے......

خُلق میں خَلق میں برہانِ خدا ہے شوکت
ایک انسان کو قرآں سراپا دیکھو

....

نقشِ قرآں ہے آپ کی سیرت
آپ راہِ عمل دکھاتے ہیں

....

مدینے میں حاضری کی طلب نے اُنھیں رنج و الم اور ہجر کی دوری کے ملال نے انھیں عجیب بے قراری اور اضطراب سے دوچار کر دیا ہے......

مجھ کو دربارِ مدینہ میں بُلا لو آقا
لوٹ آنے کی دعا میں نہیں کرنے والا

بہت سوں کو تم نے بُلایا ہے آقا
بُلا لو نا! مجھ کو بھی شاہِ مدینہ

....

کوچۂ حبیب میں حالِ دل بیان کرنے کے آرزومند شوکت ہاشمی کا دھیان جب اپنی فردِ عمل کی طرف جاتا ہے تو پاسِ ادب سے بے محابا کہہ اُٹھتے ہیں......

مدینے کو جاؤں میں کس منہ سے شوکت
کہاں میرے آقا کہاں مَیں کمینہ

....

اُنھوں نے ایسی ایسی دل کش اور دل فریب شعری زمینوں میں تخلیقی پھول کھلائے ہیں کہ بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا ہے آخر میں طویل بحر میں اُن کا یہ اظہارِ عقیدت دیکھیے..............

رحمتِ عالمیں کا یہ فیضان ہے، مجھ کو سوغاتِ مدحت عطا کی گئی
میرے آقا کا مجھ پر یہ احسان ہے، مجھ کو سوغاتِ مدحت عطا کی گئی

نعت کو لطفِ محبوبِ رب چاہیے، لطفِ محبوبِ رب کی طلب چاہیے
اور مجھے اس حقیقت کا عرفان ہے، مجھ کو سوغاتِ مدحت عطا کی گئی

میں نے اک ایک سطرِ ثنائے نبی نورِ قرآں کی کرنوں سے ترتیب دی
ہاشمی! بالیقیں میرا ایمان ہے، مجھ کو سوغاتِ مدحت عطا کی گئی

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سید قاسم جلال کا فکر و فن

زندگی تحرک سے عبارت ہے - دریا کی موجوں میں روانی اسی سے ہے آبشار اس وقت تک آبشار ہے جب تک اس میں تحرک ہے- ستاروں کی گردش میں ہی باہمی کشش کارازہے- حیات انسانی میں روح و بدن کا معرکہ حرکت و عمل کی نشاندہی کرتا ہے- اردو شعر و ادب کی فکری و ارتقائی بالیدگی میں تحرک کا اہم کردار ہے-

شعر و ادب قومی و ثقافتی حقائق کو نمایاں اور انسانی وجود کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا نام ہے - ادب کے ذریعے انسان اپنے احساسات سے روشناس ہوتا ہے- شعر و ادب کا اہم کردار ہر معاشرے میں ہے، جہاں یہ انسانی مشاہدات کو احساسات میں بدل دیتا ہے اور انسانیت کی قدرتی خصوصیات کا اظہار کرتا ہے-

ڈاکٹر سید قاسم جلال بخاری صاحب کا شمار عہد حاضر کے استاد شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے شعر و سخن کی روشنی میں بہت سے اہم موضوعات پر اپنی فکر کا اظہار کیا ہے- ان کی شاعری میں محبت، غم، خوشی اور زندگی کے دیگر پہلوؤں کے بیان کے ساتھ انسانی تجربات اور مشاہدات کا ذکر بھی ملتا ہے- ان کے شعروں میں عموماً گہرے جذبات کا احساس ملتا ہے، جو انھیں دوسروں سے منفرد کرتا ہے-

علامہ اقبال کی روش پر چلتے ہوئے سید قاسم جلال نے اپنی شاعری میں اخلاقی و اصلاحی پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی ہے- ان کی شاعری تحریک دینے والی فکر کا نام ''فکر اقبال'' زیادہ مناسب ہے بلکہ فکر اقبال میں تسخیر کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ ان کی فکر میں یوں در آئی ہے جیسے ''شاخِ گل میں بادِ سحر گاہی کا نم-''

سبطِ جمال نے ان کی شخصیت پر فکرِ اقبال کا عکس پاتے ہوئے ان کی اکیسویں صدی کا اقبال کہا ہے- یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال

طاہر حسین قادری

کی شعری کاوشیں حرکت عمل کا منفرد نمونہ ہیں ان کی شاعری میں مستقبل کے نشیب و فراز، انقلابی خواہشات، اور امت کی بقا کی خواہش کا عنصر موجود ہے۔ ان کی نظموں میں ملک اور ملت کی امامت کا بیان، انسانیت کی بقا کی تحریک اور محنت کا دعویٰ موجود ہے۔ علامہ اقبال کی شاعری میں ایک عمومی جذبے کی موجودگی کا عنصر واضح ہے جو معاشرتی اور سیاسی تحرکات کو بھرپور انداز میں بیان کرتا ہے۔ ان کا فلسفہ 'حرکت وعمل' مشرق ومغرب میں الگ شناخت کا حامل ہے۔ گوئٹے نے کہا:

"A noble person attracts noble people and knows how to holdon to them"

سید قاسم جلال اپنی شعری فکر کے ذریعے ظلم اور تعصب کو مٹانے اور حق کو پھیلانے کی بات کرتے ہیں، دیکھیے:

توڑ کر ظلم و جور کی زنجیر
لشکرِ حق کو نیک نام کریں
ہر تعصب مٹا کے سینے سے
آؤ انساں کا احترام کریں
ہے ، تعاقب میں لشکرِ اوہام
تیغِ افکار بے نیام کریں

شعر کے فکری ومعنوی اظہار پر ڈاکٹر ابوالخیر کشفی نے کہا تھا" مصرع ختم ہونے کے بعد اس کی لہریں ذہن میں پھیلتی رہتی ہے۔" اسی معنویت کا اظہار ان کے اشعار میں دیکھیے:

آ گیا ہوں میں کہاں؟ جس بزم میں
شادماں چہرے ہیں روحیں مضمحل
ہر طرف روشن ہیں برقی قمقمے
بجھ رہے ہیں لیکن انسانوں کے دل

اس مادہ پرستی کے دور میں سید قاسم جلال، حالی" اقبال اور اکبر الٰہ آبادی کی طرح ملی اور قومی اصلاح کی روش کو نبھا رہے ہیں، ملاحظہ کیجیے:

کیا ہیں اسبابِ زوالِ مسلمِ آشفتہ حال
کل جو حاکم تھا وہ اب محکوم کیسے ہو گیا

آزادی سے قبل برصغیر پاک و ہند کے مسلمان جن کا شکار تھے ہمارے اصلاح کاروں نے نہ صرف ان مسائل کی نشاندہی کی بل کے اپنی قوم کو ممکنہ حد تک اس بھنور سے نکالنے میں مصروف عمل رہے۔ سید قاسم جلال دورِ حاضر میں قوم کو درپیش مسائل کا مکمل ادراک رکھتے ہیں اور اپنے اشعار کے ذریعے شعراو ادبا اور علما سے لے کر عوام الناس تک اپنے فکری پیغام یوں پیش کرتے ہیں:

ذہن پر سایۂ اوہام رہے گا کب تک
طائرِ فکر تہِ دام رہے گا کب تک

فرقہ بندی کا تعصب بہ نگاہِ علما
جزوِ لاینفک اسلام رہے گا کب تک

.....

علامہ اقبال کی شاعری کا میلان مذہب وملت کی جانب تھا، عمل، خودی اور عرفان ذات ان کے خاص موضوع تھے۔ سید قاسم جلال کی شاعری میں بھی مذہبی وملی رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ فطرت انسانی مذہب وملت سے طبعی میلان رکھتی ہے ان کی نظموں کے عنوانات مذہب وملت کی طرف طبعی میلان کی عکاسی کرتے ہیں مثلاً، حضرت علی المرتضیٰ۔ شہید کربلا، شہادت حسین کی دعوتِ فکر، وجبرو قدر، یومِ آزادی، استاد، بابا گرونانک، نذر قائداعظم اور تجدید عہد وغیرہ کے عنوانات پر کہی گئی ان کی نظمیں قابلِ تحسین ہیں۔

انھوں نے اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی اور سرائیکی میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس کے علاوہ فارسی کے ساتھ انھیں خصوصی رغبت ہے، جس پر سخنوران فارس ان کے شعروفن کے قائل ہیں، نمونہ اشعار دیکھیے:

ای سخنور فکرِ صالح می شود روحِ کلام
از طلسماتِ تخیل خلق را حیراں مکن
شاعرِ فن! پیشِ کن افکارِ نو در شاعری
ذکرِ کیف وصلِ یار و کلفتِ ہجراں مکن
بار آور می شود سعیِ مسلسل ای جلال
فکرِ محرومی و ذکرِ تنگیٔ داماں مکن

سید قاسم جلال معاشرے میں پھیلی ہوئی ناانصافی، رشوت اور بے اعتدالی کی نشاندہی کرتے ہیں اور معاشرے کی اصلاح کی ترغیب بھی دیتے ہیں۔ مثلاً:

محتسب سچ سچ بتا خلوت میں کیا سودا ہوا
مدعی انصاف سے محروم کیسے ہو گیا

.....

آپ کے ہاں علامہ اقبال کی فکر پر کئی اشعار سامنے آتے ہیں، جیسے:

آج نخلِ مصلحت کی چھاؤں میں ہے محوِ خواب
پرورش جس کی ہوئی تھی سایۂ شمشیر میں

وہ شاعری میں پند ونصائح کے علاوہ اپنے ہم عصر قلم کاروں اور دانشوروں کو دعوتِ فکر وبصیرت کچھ انداز میں دیتے ہوئے نظر آتے ہیں:

یہ کیا تھوڑی تنقید سے چیخ اُٹھے
آپ بڑے شہ زور دکھائی دیتے ہیں

سید قاسم جلال کا علمی سرمایہ یقیناً وسیع اور وقیع ہے جو علم وادب میں ایک خوبصورت اضافہ ہے۔ آپ کے علمی وفکری پہلوؤں کو تفصیلاً دیکھنا ہو تو شفیق الرحمٰن الٰہ آبادی کی مرتبہ تصنیف کا مطالعہ ضروری ہے۔ اللہ کریم بطفیل رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی علمی و ادبی کاوشوں کو قبولیت عامہ عطا فرمائے اور اُن کی ذات سے خیر کا چشمہ یونہی رواں دواں رہے۔

☆☆☆☆☆

رُباعی کے استاد شاعر ___ محمد نصیر زندہ

سبز ہلالی پرچم لہرانے اور آزادی کے گیت گانے کے ان پابند اگست موسموں میں ماتم و سوگ سا سماں ہے، چہار سو دِل دِل پاکستان کی نہیں بل کہ بِل بِل پاکستان کی صدائیں ہیں، یہ ظلم کی انتہائیں ہیں۔ معاشی بحران، کمر توڑ مہنگائی، بھوک اور بیروزگاری نے پاکستان اور پبلک آف پاکستان کو تنزلی کی گہری دلدل میں دھکیل دیا ہے۔ محمد نصیر زندہ کے الفاظ میں:

حریت پیٹ میں پگھل جاتی ہے
تہذیب روایت سے پھسل جاتی ہے

تم کرتے ہو بات حضرتِ انساں کی
یہ بھوک تو مذہب کو نگل جاتی ہے

.....

ٹی وی ٹاکروں مذاکروں میں بیٹھے اکثر اینکر پرسنز و تجزیہ کار اور سیاسی جماعتوں کے ترجمان و عہدیداران میرے ''سنگی'' ہیں بل کہ بھائی بھی ہیں مگر میں ان دنوں بہت ہی کم ٹی وی دیکھ پاتا ہوں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ جب بھی ٹی وی کرو آن تو آگے سے سن لو معافی، معافی معافی، کی گردان۔ ہر کسی نے ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے کہ میں کیوں مانگوں معافی وہ مانگے معافی، پھر آگے سے جواب آئے گا کہ ہم کیوں مانگیں معافی وہ مانگے معافی جب کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ سوائے عوام کے یہ کرتا دھرتا خواص و اشرافیہ سب کے سب مانگیں معافی خالق سے بھی اور خلق سے بھی، یہ جو 75 برسوں سے ملک و قوم پر مسلط رہے یہ سارے مجرم ہیں مگر حصہ بقدر جثہ ہے۔ کوئی تین سالوں کی معافی مانگے اور کسی کو تیس سالوں کی توبہ توبہ کر کے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگنا پڑے گی۔ بقول محمد نصیر زندہ:

مظلوم کا کردار بدل جاتا ہے
انداز ستم گار بدل جاتا ہے

ہوتا نہیں اربابِ سیاست کا ضمیر
انصاف کا معیار بدل جاتا ہے

.....

میں ان سیاستوں و صحافتوں اور حکمرانوں و پرودھانوں سے اس قدر مایوس ہوا ہوں کہ میں نے اپنے کالم کا چلن ہی بدل ڈالا ہے، اب میں سیاستِ دوراں اور حالاتِ حاضرہ سے زیادہ شعر و ادب و اہل ادب کے بارے میں بات کرنے لگا ہوں، آج بھی میرا خیال تھا کہ بنتِ جوش ملیح آبادی محترمہ تبسم ملیح آبادی جی کے حوالے سے لکھوں گا، میں نے تو اپنے ذہن میں یہ عنوان تک ترتیب دے رکھا تھا کہ ''جوش ملیح آبادی سے تبسم ملیح آبادی تک''

راجہ شاہد رشید

لیکن ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے الفاظ میں، میں نے جو سوچا تھا مضمون چوری ہو گیا۔ در حقیقت ہوا کچھ یوں ہے کہ رباعی کے نامور شاعر محمد نصیر زندہ کی کتاب ''میرا دوسرا وجود'' نے اچانک ہی آ کر دستک دے دی اور پھر میں اسی کا ہو کر رہ گیا۔ ملاحظہ فرمایئے:

مرنے پہ مری برات رکھ دی اس نے
تشنہ لگہِ حیات رکھ دی اس نے

میں نے کہا اسرارِ علی مجھ کو بتا
سر پر مرے کائنات رکھ دی اس نے

....

معروف شاعر برادرم و محترم طاہر یاسین طاہر اس کتاب میں شامل اپنے مضمون ''محمد نصیر زندہ جدید رُباعی کا کوزہ گر'' میں ایک جگہ یوں رقمطراز ہیں کہ ''محمد نصیر زندہ نے اپنے شعری مجموعہ کا نام ''میرا دوسرا وجود'' رکھا ہے، انہوں نے اپنی ذات کا وجدان پا لیا ہے اور بڑی مہارت سے اپنے اندر کے شاعر کو پورے قد و قامت کے ساتھ زندہ رکھا ہوا ہے۔ ان کا تخلص اس پر معتبر دلیل بھی ہے۔ یہ ان کا پانچواں شعری مجموعہ ہے۔ اس سے ان کی مہارت اور استادانہ چابک دستی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کتاب کا نام اس بات کی دلیل ہے کہ محمد نصیر زندہ اپنی ذات کا گیان حاصل کر کے ذات سے آگے کا سفر شروع کر چکے ہیں۔'' محمد نصیر زندہ فرماتے ہیں کہ:

تجدیدِ کہن فنا کی مٹی میں ہے
تعمیرِ نو قضا کی مٹی میں ہے

وا ہوں گے نہاں خانۂ تخلیق کے در
آدم ابھی کربلا کی مٹی میں ہے

....

محمد نصیر زندہ عہدِ موجود کے سربلند شاعر ہیں اور ان کا شمار بلاشبہ رُباعی کے اساتذہ میں ہی ہونا چاہیے۔ انہوں نے ایک بار مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ راجہ صاحب! شاعر کو یا تو فقیر ہونا چاہیے یا پھر بادشاہ ہونا چاہیے کیونکہ شعر کہنے کے لیے شاعر کا بے لوث و بے نیاز ہونا لازم و ملزوم ہوتا ہے۔ میری رائے میں برادرم محمد نصیر زندہ آج ادب نگر کے شاہ ہیں اور رُباعی کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ پورے پوٹھوہار میں اس طرز و لیول کا رباعی گو کوئی نہیں۔ میرے پوٹھوہار میں عمومی طور پر چوبرگے کو ہی رُباعی بولا جاتا ہے جو کسی طور پر بھی درست نہیں ہے، اور تو اور اکثر اہلِ زبان و ادب بھی چوبرگے کو بیت بولتے ہیں، بھلا بیت بھی کوئی صنفِ سُخن ہے کیا؟ بیت تو شعر کو کہتے ہیں چاہے وہ کسی بھی صنفِ سُخن کا ہو۔ چو برگہ ایک مقبول صنفِ سُخن ہے جسے چومصرعہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ آخر میں محمد نصیر زندہ کی ایک اور رُباعی ملاحظہ فرمایئے:

تبدیل خداؤں میں صنم ہوتے ہیں
تجدید کے بُت نسبِ حرم ہوتے ہیں

کرتی ہے خرد جب نئے کعبے ایجاد
شمشیرِ قلم سے سر قلم ہوتے ہیں

☆☆☆☆☆

دردِ انسانیت میں تڑپتے دلوں کے نام

وہ دور بہت دُور چلا گیا ہے جب انسانوں کی رگوں میں ایسا خون دوڑتا تھا جو انسانی تعلق پر نسلوں تک وفا کا پہرہ دینے کا پابند ہوتا تھا انسانیت کا یہ معیار تھا کہ دوست کے پسینے پر خون چھڑکتے تھے اور آج مشکل وقت میں منظر سے غائب ہونے والے خون اپنے سفید ہونے کا اعلان کر جاتے ہیں خوشی کی عمر کس قدر قلیل اور غم کی عمر کتنی طویل ہوتی ہے جب انسان خود پر لاگو فرائض انسانیت کی ذمہ داری کا احساس محسوس کرتا ہے تو خوفناک خدشات کسی المناک حادثے سے دوچار ہونے کی خبر دے رہے ہوتے ہیں یہ روح کی بیداری کا احساس تو ہے لیکن وہ کیا کرے جس کا دل احساس انسانیت سے تو مالا مال ہو مگر دولت دنیا کے اعتبار سے کنگال ہو ان حالات میں انسانیت کے دکھ کے ساتھ ساتھ اپنی بے بسی کا دکھ بھی سینے میں چبھتے خنجر کی طرح پڑا رہتا ہے۔

زندگی کو کب تک خوبصورت منظروں کا فریب دیا جاسکتا ہے اک دن بدصورت مقدروں کی تلوار ساری حسرتوں کا سر قلم کر دیتی ہے انسان کی حالت بے بسی اس کی زندگی کے منہ کا ذائقہ کڑوا کر دیتی ہے اور وہ انسان جو خدا کی محبت بن کر زمین پہ اترا تھا وہ کہنے لگا کہ گواہ رہنا اے روح کائنات میں بے حس خود غرض لاپرواہ اور ظالموں کے بیچ میں زندہ رہنے کا عذاب جھیل رہا ہوں۔

غربت و بے بسی کی بلاؤں کے نزول نے سانس لینا دشوار بنا رکھا ہے مفلس کے حالات اور زندگی کے تصادم میں حشر انسان دیکھ کر میری روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے دنیا کے بازار میں ضروریات زندگی خریدنے کی سکت نہ رکھنے والوں کو خالی ہاتھ لوٹتے دیکھتا ہوں تو ان کے چہرے دل خراش داستانیں سنا رہے ہوتے ہیں جو میرا سینہ چھلنی کرتی ہیں سچ بتاؤں تو میں دُکھیا انسانیت پر گُھٹنے والا انسان بن چکا ہوں ہر متاثر انسان مجھے میرے وجود کا حصہ محسوس ہوتے ہیں اور یہ احساس ساری دنیا کا احاطہ کیے ہوئے ہے کسی غریب کے گھر کا چولہا نہ جلے تو میرے سینے سے دھواں اُٹھنے لگتا ہے بھوک سے پیٹ بھرنے والوں کی پسلیاں دیکھ کر میرے وجود کی ہڈیاں مجھے چبھنے لگتی ہیں کسی کونے میں چھپ کر رونے والوں کی آوازیں سن کر میری کم بخت آنکھیں آنسو برسانے لگتی ہیں تنگدستی کی چارپائی پر پڑے کسی غریب کے جاتے جنازے کو

ظفر اقبال ظفر

دیکھ کر ایسے لگتا ہے جیسے میری ہی روح دور کھڑی اپنے جسم کو دنیا سے جاتا دیکھ رہی ہے کئی گھڑیاں اس کیفیت میں گزارنے کے بعد ہوش کر کے کہتا ہوں اللہ نہ کرے کہ کسی بدبخت کے سینے میں ابوالانسان کا دل دھڑکنے لگے۔

غم جب دل کے دروازے پر دستک دیں تو ان کو مہمان ٹھہرالیں اس کے درد کی دوا کریں اور انہیں رخصت کر دیں ہمدردوں کا معمول زندگی تو یہی ہونا چاہیے مگر مجھے خوش رہنے کا یہ ہنر ساری زندگی نہ آسکا میں غم کو پال پوس پروان چڑھاتا چھاتی سے لگائے اس طرح دودھ پلاتا رہتا جیسے میں دُکھوں کی وہ ماں ہوں جو حالات کے ہاتھوں زخمی بچوں کو بھولنے کے بجائے ہر لمحہ ان کی فکر میں لگی رہتی ہے میرے بچوں کے چہروں پر مسکان نہیں ہے اس لیے مجھے مسکرانے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے کبھی عالم تنہائی میں گزرے وقت کے کسی واقعے کو یاد کر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی جنبش ہو جاتی تو چہرے پہ خوف طاری ہو جاتا مجھے ہنسنے کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے جس قدر ہنسوں اُسی قدر رُلایا جاؤں گا۔

میری رُوح ضرور عالم ارواح میں پیغمبروں کی ہمسایہ رہی ہوگی جو سب کا غم کھانا اس کی فطرت بنی ہوئی ہے غم یہ نہیں کہ میری روح غم کھانے والی ہے غم تو یہ ہے کہ میرا وجود غم انسانیت مٹانے میں کمزور حالات کا مالک ہے کاش میں خزانہ قدرت سے کچھ خوشگوار لمحے چرا کر مفت میں اُن تلخ زندگیوں کے دامن میں ڈال دیتا جو خواب میں بھی اپنی آنکھوں سے بڑے خواب دیکھتے ہیں تو رو پڑتے ہیں۔

ان والدین کا حال کون جانتا ہے جو اپنے بچوں کو آسانی کا راستہ دینے کے لیے خود مشکل کی راہ پر نکل پڑتے ہیں ان کی زندگی شیریں چیزوں کا دسترخوان نہیں بلکہ ہر وقت زبان پر حالات کی کڑواہٹ کا ذائقہ رہتا ہے ان حالات میں جینے والے لوگوں کا زندہ رہنا سخت جانی کا معجزہ ہے۔

حیات خود غرضیت کے مریض احساس انسانیت سے خالی لوگ میری مشکل پر ہنستے ہیں تو میں ان کے ہنسنے پر دل تھام کے روتا ہوا دریا شرمندگی میں ڈوب جاتا میرے آنسو ظالموں کے تعاقب میں لگے ہیں خدا قاتل انسانیت کی اُداسیوں کی عمر دراز کرے۔ آمین ثم آمین

آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ اس لکھاری نے اپنی تحریر میں کیسی غم کی منڈی لگا رکھی ہے میری روح کا ماننا ہے کہ غم خدا کی بخشی ہوئی بہت بڑی نعمت ہے اس سے کنارہ کشی کفران نعمت ہے صوفی کہتا ہے کہ جو بھی غم سے دور ہے اُس پر عذاب لازم ہے کیونکہ یہ طریق خداوند کے خلاف ہے اگر آپ غم انسانیت کے خزانوں سے بھرے دل و دماغ کے مالک ہیں تو مبارک ہو آپ صرف اک انسان ہی نہیں فخر انسانیت ہیں ایسے ہی لوگ تاریخ کا عطر ہوا کرتے ہیں انسانی دل کے آئینے میں چمک تب تک نہیں آتی جب تک اس کے پیچھے غم کا زنگ نہ لگا ہو مستحق ضرورت مند مجبور انسانوں کی مدد کے واسطے جانے والوں کے آگے پیچھے خدا کا نور چلتا ہے روح انسانیت انہیں سلام پیش کرتی ہے۔

☆☆☆☆☆

وجہِ زندگی تم ہو

ایسا نہیں ہے کہ اس سے شادی سے پہلے محبت تھی بلکہ کہنا چاہیے کہ میں نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ وہ میری کزن ہے اور میں اس کو بچپن سے جانتا ہوں۔ ہوا یہ کہ میرے لیے میری والدہ صاحبہ اس کی بڑی بہن کا نام لیتی تھیں جیسے کہ اکثر گھروں میں ہوتا ہے کہ رشتے بچپن میں طے ہو جاتے ہیں یا نام لے لیے جاتے ہیں۔ لیکن مجھے اس کی بہن (باجی) سے شدید قسم کی چڑ تھی۔ اس کی شکل مجھے مدرسے کی استانی کی سی لگتی تھی جیسے ابھی درس دینے لگے گی۔ باجی اپنی ضد کے لیے مشہور بھی تھیں بلکہ ابھی تک ہیں۔ تو ہوا یوں کہ مجھ سے چھوٹے بھائی کو شادی کا چاؤ چڑھ گیا۔ اس وقت تک مجھے نوکری تو مل چکی تھی لیکن ابھی تربیت باقی تھی اور میں اس نوکری سے مطمئن بھی نہیں تھا۔ میں امتحان دے کر اچھی نوکری حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بھائی صاحب نے شادی کے لیے زور لگانا شروع کر دیا کیونکہ وہ والدِ گرامی کے ساتھ کاروبار میں ان کی مدد کیا کرتے تھے اور بقول ان کے آج ہم جو بھی ہیں صرف ان ہی کی تو بدولت ہیں کیونکہ انھی نے ہی تو کاروبار کو چلایا ہے۔ اسی وجہ سے گھر میں ان کا سکہ چلتا تھا اور میں بے چارہ کسی کونے میں پڑا نظر آتا۔ ان کی اس بے وقت کی راگنی سے مجھ میں بھی بڑے بھائی والا جوش و خروش ٹھاٹھیں مارنے لگا اور میں نے اعلان کر دیا کہ جب تک میری شادی نہ ہوئی تو میں ان کو بھی شادی نہیں کرنے دوں گا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ گھر میں سراسیمگی پھیل گئی کہ اب تو رشتہ ہو گیا اور شادی بھی تیار ہے تو یہ کیا ڈرامہ ہے۔

بہر حال والدہ محترمہ کا ووٹ میری جانب تھا کہ بچہ درست کہتا ہے۔ آخر بڑا ہے تو اس کا بھی رشتہ تو ضرور ہو جانا چاہیے چاہے شادی بعد میں ہو جائے۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا کہ کہیں رشتہ طے کر دیا جائے اور اگر ہو سکے تو بھائی کی رسمِ ولیمہ پر نکاح کر دیا جائے۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ لڑکی کہاں سے تلاش کی جائے؟ خاندان پر نظر ڈالی گئی تو تین چار رشتے نظر آئے جس میں باقی میں نے خود مسترد کر دیے ایک ہی رشتہ قبول کیا جو آج تک قائم ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ لڑکی کے گھر جا کر بات کون کرے

محمد کلیم

کیونکہ ہمارے خالو کے خیالات ہمارے خاندان سے بہت مختلف تھے۔
کئی قسم کے اختلافات تھے مثلاً
نمبر ایک: ان کا مسلک مختلف تھا اور ان کے بقول ہم مسلمان کی تعریف پر پورا نہیں اترتے تھے۔
نمبر دو: ان کے سیاسی نظریات ہم سے جدا اور الگ سیاسی جماعت سے وابستگی تھی جس بنا پر بچپن میں میری مارکٹائی تک کی نوبت آچکی تھی۔
نمبر تین: ان کا مزاج دھیما تھا اور وہ ہمیشہ میٹھے لہجے اور دھیمے سروں میں بات مکمل کرتے تو دوسری طرف ہماری طرف اونچے سروں میں بات کی جاتی سونے پر سہاگا یہ کہ ہر جملے میں دو تین گالیوں کا تڑکا ضرور لگایا جاتا جو نم طبیعت پر گراں گزرتا۔
اس طرح کے ماحول میں مجھے 100 کیا 200 فی صد یقین تھا کہ انکار ہی ہوگا۔
ان حالات میں نانی جان (اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے) نے ڈھارس بندھائی اور کہا کہ رشتہ بھیج دو انکار نہیں ہوگا۔ اللہ کا نام لے کر والدین کے ہمراہ بھائی (جن کی شادی طے تھی) رشتہ لے کر خالہ کے گھر پہنچے اور ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہاں سے اقرار ہو گیا۔ صرف خالو نے اتنا پوچھا کہ لڑکا پولیس میں ہوتا ہے؟ کیونکہ ایک مرتبہ انھوں نے ہمارے گھر میں وردی ٹنگی ہوئی دیکھی تھی (اس وقت رشتہ طے نہیں ہوا تھا) تو پوچھا یہ وردی کس کی ہے؟ تب والدہ محترمہ نے بتایا تھا اور وہ بات آج کام آ گئی۔ بہر حال ہفتے بھر میں ہی نکاح ہو گیا لیکن رخصتی کو تربیت مکمل ہونے تک مؤخر کر دیا گیا۔
اب فیصلہ تو یہی کیا گیا تھا لیکن ہوا وہی جو رب العالمین کو منظور تھا۔ ہوا کچھ یوں کہ نکاح (جو اب تک قائم ہے) کے کوئی سال بعد جب میں اسلام آباد پولیس کالج سہالہ میں زیرِ تربیت تھا تو میری منکوحہ کو ہمشیرہ سعودی عرب سے ملنے تشریف لے آئیں۔ چونکہ ان کا قیام مختصر تھا اور وہ میرے سسر صاحب (خالو) کی لاڈلی بھی خوب تھیں اس لیے ان کی خواہش تھی کہ رخصتی ان کی موجودگی میں کر دی جائے۔ تو ان کی خواہش کا احترام کیا گیا۔ میں پولیس کالج سہالہ میں آگے سے دوڑے چل کر رہا تھا اور صبح سے رات تک پھٹیک کی مار جھیل رہا تھا تو گھر سے پیغام آ پہنچا کہ اُدھر سے رخصتی کے لیے دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ رخصتی کے لیے دباؤ تو لڑکے والے ڈالتے ہیں لیکن یہاں تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔ دورانِ تربیت ہی رخصتی کا ڈول ڈالا گیا۔ میں صرف چار دن کی چھٹی لے کر شادی پر پہنچا اور یہ نیک کام

کرتے ہی واپس سہالہ چلا آیا اب پھر وہی پھٹیک اور پھر وہی آگے سے دوڑے چل۔ شادی کے بعد میرا دل تربیت میں بالکل نہیں لگتا تھا۔ میں اداس رہنے لگا۔ دل ہر وقت ان کی یاد میں کھویا رہتا۔ وہ معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے رہتا۔

ہجر ہوتا نہیں آسان دعا ہے یہ کلیم
وقت کو تیز بہت تیز چلایا جائے

یہاں ایک بات کرنا ضروری ہے کہ نکاح کے بعد ہمیں جو ایک سال کا وقت میسر آیا تھا اس عرصے میں ایک دوسرے کو جاننے کا بہت اچھا موقع ملا تھا۔ ایک بات تو طے ہے کہ لڑکیاں لڑکوں سے زیادہ سمجھ دار، معاملہ فہم، سنجیدہ اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والی ہوتی ہیں۔ ان کو رشتے نبھانے کا ڈھنگ اچھے طریقے سے آتا ہے جبکہ لڑکے بس جسم کی خواہش لیے پھرتے ہیں۔ یہ بات ضمناً آ گئی۔ جب نکاح ہوا تو زوجہ محترمہ صرف انٹر کی طالبہ تھیں اور نکاح والے دن بالکل گڑیا لگ رہی تھیں۔ خوشی اور مستقبل کے اندیشے معصوم چہرے پر عیاں تھے لیکن ارادے پختہ تھے۔

زوجہ صاحبہ ہمیشہ ایک اچھی طالبہ رہیں بلکہ آج بھی ہیں (آج کل ایم فل اردو کر رہی ہیں)۔ ان کے نمبر میٹرک اور انٹرمیڈیٹ دونوں میں زیادہ ہیں۔ یہاں یہ بات بھی بتانا ضروری ہے کہ میں کوئی نکما نہیں ہوں۔

ایک سال میں ہماری خوب گپ شپ رہی۔ میں گاہے بگاہے ان کے گھر جاتا اور نگاہوں کو تسکین پہنچاتا رہتا۔ اس ایک سال میں ہم نے کئی خواب دیکھے، کئی منصوبے بنائے۔ جب میں پولیس کالج میں زیرِ تربیت تھا تو ہر دن میں ان کی کال کا منتظر رہتا یوں میرے پہلے چھ مہینے تربیت کے کافی اچھے گزرے کیونکہ روز آدھا گھنٹہ بات ہو جاتی اور میں اگلے دن کے لیے تیار ہو جاتا مگر رخصتی کے بعد ایسا لگتا تھا کہ میں جسمانی طور پر پولیس کالج میں ہوں لیکن میری روح کہیں ملتان میں ہی رہ گئی ہے۔ بہرحال اچھا یا برا وقت آخر کار گزر ہی جاتا ہے۔ یہی میرے ساتھ ہوا کہ میں تربیت پا کر واپس آ چکا تھا۔ اب تو ہر روز، روزِ عید تھا اور ہر شب شبِ برات۔

صرف دو مہینے ایسے گزرے ہوں گے کہ میری مقابلے کے امتحان کی ڈیٹ شیٹ آ گئی اور ساتھ ہی زوجہ کے بی ایس سی کے پیپرز کی ڈیٹ شیٹ بھی آ گئی۔ میں نے سوچا کہ ایک تیر میں دو شکار کیے جائیں تو اس کا حل یہ نکالا کہ زوجہ کو ان کی والدہ یعنی میکے میں چھوڑا جائے یہ بات سن کر وہ ناراض ہو گئی اور اپنے میکے جانے سے انکار کر دیا اور مجھے جواب دیا کہ اب مجھے مزید پڑھنے کی ضرورت نہیں جب شادی ہو چکی ہے اور اچھے طریقے سے چل رہی ہے۔ آخر لڑکی

نے شادی ہی تو کرنی ہوتی ہے اس بات کا میں نے جواب دیا کہ بالکل ٹھیک ہے مگر آپ کی تیاری ہے آپ پیپرز دے لیں۔ اصل میں وہ مجھ سے دور نہیں جانا چاہتی تھیں۔ آخر کار میں نے ان کو قائل کر لیا اور ان سے وعدہ کیا کہ میں ہر روز ان سے ملنے آؤں گا اس طرح ہم دونوں نے امتحان دیا اور قسمت کی کرنی دیکھیں دونوں امتحان میں پاس ہو گئے۔ اسی دوران وہ امید سے بھی ہو گئی جبکہ میں امتحان پاس کر کے انٹرویو کی تیاری کرنے لگا۔

بقول منیر نیازی:

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

.....

انٹرویو سے کچھ دن پہلے عبداللہ کلیم دنیا میں تشریف لے آئے۔ سوکھے پتلے سے جیسے کسی نے کھینچ کر لمبا کر دیا ہو۔ بڑی بڑی گول آنکھیں، گھنگریالے بال، سانولا سلونا رنگ، من موہنا چہرہ اور میٹھی میٹھی آواز ان کے رونے سے میری نیند تو کہیں کھو ہی گئی۔ میں سوچتا ہوں کہ ماں کا کیا حال ہوتا ہوگا جو ساری رات بچے کو چپ کرانے، صاف کرنے اور دودھ پلانے میں مصروف رہتی ہے جبکہ مرد صرف اس کا رونا بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ میں زوجہ سے کہا کرتا تھا کہ تم نے میرا رقیب پیدا کر دیا ہے۔ جب میں تم سے کوئی بات کرنا چاہتا ہوں یہ صاحب رونا شروع کر دیتے ہیں اور بات کہیں بیچ میں ہی رہ جاتی ہے۔

جب ہماری شادی ہوئی تھی تب زوجہ کو کچھ پکانا نہیں آتا تھا مگر وہ ایک باہمت خاتون ہیں اور انہوں نے میری والدہ کی رہنمائی میں چند ماہ کے اندر اندر کھانا بنانا سیکھ لیا اور آج ہمیں لذیذ کھانے (واقعی لزیز) پکا کر کھلا رہی ہیں۔

عبداللہ کی پیدائش اور ان کے بی ایس سی کر لینے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ آپ ایم اے کر لیں۔

وہ کہنے لگیں کہ ایم ایس سی ریاضی کرنا چاہتی ہوں۔

میں نے کہا وہ تو پرائیویٹ نہیں ہوگا۔

میں نے ان کو کئی دوسرے مضامین کے نام دیئے مثلاً تاریخ، مطالعہ پاکستان سیاسیات، اسلامیات وغیرہ لیکن انھوں نے کہا کہ ان مضامین میں میری بالکل دلچسپی نہیں۔

اصل میں انھی دنوں میں نے ایم اے مطالعہ پاکستان کیا تھا کیونکہ بی بی اے کرنے کے بعد میری پولیس میں نوکری ہو گئی تھی۔

انھوں نے کہا کہ اگر پرائیویٹ کرنا ہی ہے تو میں ایم اے اردو کروں گی کیونکہ ریاضی کے بعد میرا پسندیدہ مضمون اردو ہے۔

میں نے فوراً ان کا داخلہ بھجوا دیا۔ اس طرح انھوں نے ایم اے اردو کر لیا اردو سے محبت

ان کو وراثت میں ملی ہے۔ میری ساس صاحبہ نے بھی اپنے دور میں بی اے اردو ادب کے اختیاری مضمون کے ساتھ کیا تھا اور چلتے پھرتے وہ میر، سودا، غالب اور اقبال کے اشعار سناتی رہتی ہیں۔ میں نے اکثر ان کی زبان سے یہ اشعار سنے ہیں۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی تک روتے روتے سو گیا ہے
(میر)

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے
(سودا)

زوجہ کو بھی اتنے اشعار یاد ہیں کہ اللہ کی پناہ (ہمیں آج تک ایک بھی شعر صحیح ترتیب میں یاد نہیں ہوا)

اشعار پڑھ کر ان کی موسیقیت سے وزن جان جاتی ہیں۔ جبکہ ہم فاعلاتن فاعلاتن فاعلن کرتے رہ جاتے ہیں۔ یہ سب پچھان کو خالہ یعنی ہماری ساس کی وجہ سے ملا ہے۔

ان کے تلفظ پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ کوئی لفظ اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا اور وہ سارا دن میرا تلفظ درست کرتی رہتی ہیں۔ مگر مجال ہے کہ ہم نے گزر کو غزر نہ کہا ہو۔ میرے تلفظ کی اور بھی کئی اغلاط ہیں جو وہ گاہے بگاہے جتاتی رہتی ہیں لیکن میرے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔

یہ سچ ہے کہ مجھے محبت کرنا میری زوجہ نے سکھایا ہے۔

میں نے عبداللہ کی پیدائش کے تقریباً ایک سال بعد پولیس کی نوکری کو خیر باد کہہ دیا کیونکہ مجھے لگتا تھا

" It is not my cup of tea."

آپ خود سوچیں کہ اچھی بھلی سرکاری نوکری اور وہ بھی تھانیدار کی۔ بندہ چھوڑ دے!!!!!

جس کی وجہ سے ہمارا رشتہ ہوا تھا اور بیوی اُف تک نہ کہے۔ حالانکہ نوکری چھوڑنے پر میرے والد صاحب نے سخت لعن طعن کی اور صاف کہہ دیا کہ میں اس کو کوئی پیسہ نہیں دوں گا۔ یہ ناکام آدمی ہے لیکن بیوی نے کچھ نہ کہا۔ میں نے اس دوران ٹیوشنز پڑھانا شروع کر دیں۔ مقابلے کے امتحان میں میرا اس سال میرٹ پر نام نہیں آیا تھا۔ میں نے شادی کے ابتدائی سالوں میں کوئی خاص خریداری نہیں کروائی۔ زیادہ وقت نوکری اور پڑھائی میں مصروف رہتا۔ کبھی کوئی سوٹ خرید دیا اور کبھی تفریح کے لیے زیادہ سے زیادہ کمپنی باغ تک ہو آئے۔ لیکن مجال ہے کوئی لفظ ان کی زبان پر آیا ہو۔ ان کو مجھ سے صرف دو باتوں کی امید رہتی تھی۔ ایک یہ کہ میں ان کو عزت دوں بلکہ عزت رکھوں، اور دوسرا یہ کہ وفادار بن جاؤں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جوان مرد کے لیے یہ دونوں باتیں نبھانا مشکل ہوتی ہیں۔ میں کوئی بے وفا نہیں تھا لیکن میری آنکھیں

چلتی رہتی تھیں۔ جبکہ زوجہ کی نظر اتنی تیز تھی کہ میری آنکھ کی جنبش پر ان کی نظر ہوتی تھی۔ کوئی دیکھے نہ دیکھے زوجہ تو دیکھ رہی ہے۔ میرا اُس وقت یہ ماننا تھا کہ دیکھنے سے کیا ہوتا ہے مگر بھائی مت پوچھو بہت کچھ ہو جاتا ہے۔ دنگا، فساد، لڑائی وغیرہ وغیرہ بہر حال نظریں اب جا کے کچھ قابو میں آئی ہیں ورنہ اکثر بھٹک ہی جایا کرتی تھی۔

''عورت کی بھی عزت ہوتی ہے۔'' یہ بات بڑی مشکل سے مجھے سمجھ آئی۔ حالانکہ سب اپنی ماں کی عزت کرتے ہیں لیکن اپنے بچوں کی ماں کو پاؤں کی جوتی ہی سمجھتے ہیں۔ نہ جانے کیوں ہم لوگ اپنی بیویوں کا مذاق اڑا کر اور ٹھٹھے مار کر ہی خوش ہوتے ہیں۔

دو مزاحیہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

ہوئے ہیں ساس بیوی سالا اکٹھے
مری کیسے کٹے گی رات گھر میں

بڑی باتیں یہاں جو کر رہے ہیں
کہ کھاتے روز ہیں وہ لات گھر میں

.....

ہمارے مزاحیہ اشعار کا زیادہ تر موضوع بیوی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ بیوی کو مذاق کا نشانہ بنا کر خوش ہوتا ہے۔ کچھ یہی حال جناب میرا بھی تھا عزت
''مائی فٹ''
سب کچھ ہم کریں اور عزت ان کو دیں۔

عبداللہ جب چار سال کا ہوا تو گھر میں رحمت اتری۔ اور میں بنیہ کلیم کا والد بن گیا۔ اب گھر چھوٹی گول مٹول سی بنیہ سے کھل اٹھا۔ جو وقت میں بنیہ کو دیتا تھا اس کا پانچ فیصد بھی عبداللہ کو نہ دے سکا تھا۔ بات شاید یہ تھی کہ بنیہ کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے میں سول سروس جوائن کر چکا تھا۔ میری تربیت بھی مکمل ہو گئی تھی (ویسے تربیت کبھی مکمل نہیں ہوتی) کچھ تھوڑا سا وقت اب میں اپنے بیوی بچوں کے لیے نکال پاتا تھا۔ حالانکہ سول سروس جوائن کرنے کے بعد مجھے اپنا شہر چھوڑنا پڑا تھا۔ پرائے شہر میں کیونکہ میرے پاس بیوی بچوں کے علاوہ کوئی اور نہیں تھا اس لیے اس دوران میں اپنے بیچ میٹس کو دیکھتا تو دل میں ایک نئی ترنگ اٹھتی کہ کاش میں شادی شدہ نہ ہوتا۔ میں بھی کوئی امیر کبیری بیوی لے آتا۔ زوجہ کو یہ باتیں محسوس ہوتی تھیں۔ اس دوران میں نے کبھی خود کو بچوں سے دور نہیں رکھا۔ جہاں بھی میرا تبادلہ ہوا میں بچوں کو ساتھ لے کر گیا۔ جس کی وجہ سے کافی گناہ و ثواب سے بچ گیا۔ زوجہ نے بھی وقت کے ساتھ ساتھ خود کو تعلیم اور شخصیت سازی کے ساتھ جوڑ کر رکھا۔ جس وجہ سے ہمارے نظریاتی اختلافات کے باوجود محبت بلکہ عشق کی فضا پنپنے لگی۔ ایک کام انھوں نے یہ کیا کہ گھر میں لڑائی جھگڑے بالکل ختم ہو

گئے (ویسے سچ میں یہ کبھی ختم نہیں ہوتے) کہ جب بھی میں غصے میں ہوتا تو وہ لب سی لیتیں تاکہ مجھے مزید غصہ نہ آئے۔ ان کا یہ حربہ کافی کارگر ثابت ہوا۔

مجھے لگتا ہے کہ عورت کی کامیابی اچھی ماں بننے میں ہوتی ہے (ویسے کچھ وقت خاوند کو بھی دے دینا چاہیے) میری بیوی نے دونوں بچوں کو جتنی محبت اور پیار سے پالا ہے اس کی مجھے کوئی مثال نہیں ملتی۔ ان کی تعلیم سے لے کر باقی تمام اشیا کا وہی خیال رکھتی ہیں۔ عبداللہ ماشاءاللہ اے لیول کر رہا ہے۔ اور حبیبہ او لیول میں ہے۔ دونوں اپنی کلاس کے ہونہار طالب علم ہیں۔ اور جماعت میں فرسٹ پوزیشن لے کر آتے ہیں۔ دونوں اونچا نہیں بولتے، اپنے کام سے کام رکھتے ہیں، صفائی پسند ہیں، بس ذرا کم گو ہیں جس کی وجہ سے اکثر لوگ ان کو مغرور سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ سچ تو یہ ہے کہ جب گھر میں کسی کی بھی برائی نہیں ہو گی تو کم ہی بولا جائے گا۔

آج کل زوجہ صاحبہ ایم فل اردو کر رہی ہیں۔ وہ اپنے پاس وقت بلکہ بے شمار وقت کا رونا روتی رہتی تھیں تو میں نے مشورہ دیا کہ ایم فل کر لیں۔ اب کورس ورک مکمل ہو چکا ہے۔ ریسرچ کی تیاری زور و شور سے جاری ہے۔ جتنی محنت سے انھوں نے زندگی میں تمام کام کیے، اسی طرح ایم فل بھی کر رہی ہیں۔ امید واثق ہے کہ گولڈ میڈل ان کا ہو گا۔

ہمارے ہاں محبت کا تصور ہمیشہ پہلی نظر سے منسوب ہے، جبکہ محبت ہمیشہ ساتھ رہنے سے، ساتھ نبھانے سے، ساتھ دینے سے ایک دوسرے کے لیے قربانیاں دینے سے اور ایک دوسرے کو سمجھنے سے ہوتی ہے۔ کچھ اسی قسم کی محبت مجھے اپنی زوجہ سے ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میرا ان کا کوئی اختلاف نہیں۔ وہ بہت زیادہ مذہبی ہیں اور میں ذرا لبرل (کچھ اور نہ سمجھیں) قسم کا بندہ ہوں۔ وہ ہر شے میں ترتیب کی قائل ہیں اور میں نے زندگی میں کبھی کوئی ترتیب بنائی ہی نہیں۔ وہ آہستہ بولتی ہیں اور میرے گلے میں سپیکر لگا ہوا ہے۔ ان کو ہزاروں اشعار یاد ہیں اور مجھے ایک شعر بھی یاد نہیں۔ ان کو سب کی تاریخ پیدائش اور اہم دن یاد رہتے ہیں اور مجھے اپنی تاریخ پیدائش بھی یاد نہیں رہتی۔ ان اٹھارہ سالوں میں تمام اختلافات کے باوجود وہ میرے ساتھ ہیں اور میں ان کے ساتھ۔ کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اپنی خوشی سے اور اپنی تکمیل کے لیے۔

محبت کے لیے۔

اس لیے دل سے یہی آواز نکلتی ہے کہ

وجہِ زندگی تم ہو

دعا ہے کہ یہ رشتہ ہمیشہ قائم و دائم رہے محبت کے ساتھ۔

محبت کریں اور محبت بانٹیں۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو، سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

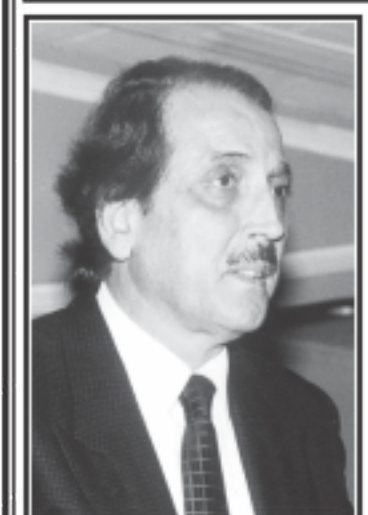

شوکت علی شاہ

پربتوں کی شہزادیاں: گلگت، ہنزہ، خنجراب پاس اور سکردو کا دورہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ بابر بادشاہ نے کشمیر کو دیکھ کر کہا تھا:

اگر فردوس برروئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است

یہ علاقے کبھی کشمیر کا حصہ ہوا کرتے تھے۔ جو لوگ کشمیر کو مشرق کا سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں وہ کشمیر کے حسن سے پوری طرح آگاہ نہیں یا پھر کبھی سوئٹزرلینڈ نہیں گئے۔ اس یورپی ملک کو انسان اور فطرت نے مل کر سنوارا اور نکھارا ہے۔ ہمارا حسن بے پروا ہے۔ اس کی وادیاں اور سر بفلک پہاڑ اپنے حسن سے

بے نیاز ہیں، مغرور نہیں۔ انہیں کسی کنگھی پٹی یا میک اپ کی ضرورت نہیں ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا حسن محدود ہے اور یہ لامحدود، وہاں پہاڑ کی ہر چوٹی تک سڑک جاتی ہے، آسانی سے وہاں تک پہنچا جا سکتا ہے۔ یہاں ثریا سے سرگرم سخن چوٹیوں تک پہنچتے پہنچتے نگاہوں کے قافلے تھک جاتے ہیں اور سروں سے ٹوپیاں تک گر جاتی ہیں۔

ہم پنڈی سے پی آئی اے کے بزرگ صورت اور درویش منش فوکر طیارے پر گلگت پہنچے۔ اس سے پہلے ایک طیارہ انہیں بلندیوں میں کھو کر عدم پتہ ہو چکا تھا۔ اخباروں کے ذریعے لوگوں نے ہاتھ تک جوڑے کہ اس طیارے کو اب میوزیم کی زینت بنا دیا جائے وہ اپنی عمر طبعی پوری کر چکا ہے لیکن انتظامیہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ہوتی بھی کیونکر! ان کے نزدیک سو آدمی گنوانے سے سولاکھ کمانا کہیں بہتر تھا۔ یہ نیک بخت تو ملتان کے حادثے کے بعد بھی اس کو جاری رکھنے پر مصر تھے۔

اُونچے پہاڑوں کے درمیان گھر گھر، گھوں گھوں، گھاں گھاں کرتا طیارہ بالآخر گلگت پہنچ ہی گیا۔ فیل بے زنجیر کی طرح سرمست تیز ہواؤں نے اُس کا راستہ روکنے کی پوری کوشش کی۔ کئی دفعہ پٹخنیاں دیں، دائیں بائیں کان مروڑے لیکن درویش کی استقامت قائم رہی اور دریائے گلگت کے کنارے سے ہوتے ہوئے ایئرپورٹ پر اُتر گیا۔ ہم نے گلگت کے واحد فور سٹار ہوٹل میں قیام کیا۔ چار کی جگہ تین سٹار بھی ہوتا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ لوگ اپنے کمرے کی کھڑکیوں سے ستاروں کو نہیں بلکہ برف پوش ناناگا پربت کو دیکھتے ہیں۔ پہلا دن تو تھکن سے زیادہ اس خوف کو اُتارنے میں لگ گیا جو بوجوہ ہوائی سفر نے پیدا کیا تھا۔ دوسرے دن چیف سیکرٹری آئی جی اور ڈپٹی کمشنر سے ملاقات ہوئی۔ ڈپٹی کمشنر اچھے موڈ میں تھا۔ کہنے لگا "شاہ صاحب! میں آپ کی تقریر سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیں تاکہ مزید باتیں کی جا سکیں۔" رات کو کھانے کے بعد ہم نے میاں غفار سے تقریر کرائی۔ میاں صاحب کو اصولی اختلاف تھا کہ ایک شخص کو ہر بار نہیں بولنا چاہئے اس طرح دوسروں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ پہلے چند جملوں میں میاں غفار کو احساس ہو گیا کہ گوبھی کے پھول اور انسانوں کے سروں میں کیا فرق ہوتا ہے۔ انہوں نے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔

دریا کے کنارے گلگت چھوٹا سا صاف ستھرا شہر ہے۔ شاہراہ ریشم کا تجارتی مرکز ہے۔ یہاں پر چین کے تجارتی قافلے آتے ہیں اور اپنی مصنوعات کا پاکستانی اشیاء سے تبادلہ کرتے ہیں۔ پرانے زمانوں میں بھی یہی ٹریڈ روٹ ہوا کرتے تھے لیکن اس وقت راستے دشوار گزار تھے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی سڑک کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ چینیوں نے پہلی بار یہ ٹیکنالوجی متعارف کرائی۔ سڑک کو جہاں تک ہو سکے دریا کے کنارے پر بنانا چاہئے۔ ان

کے تعاون سے جو سڑک بنی ہے وہ نہایت ہموار اور عمدہ ہے۔ ٹریڈ والیوم ہنوز کچھ زیادہ نہیں ہے لیکن عسکری نکتہ نظر سے نہایت اہم سڑک ہے۔ ہندوستان نے بہت واویلا کیا لیکن سڑک بالآخر بن گئی۔ بے شمار محنت کشوں اور انجینئرز نے جان گنوالی۔ ان کا ایک بہت بڑا قبرستان اب بھی شہر کے باہر موجود ہے۔

آبادی میں ویسے تو ہر مسلک کے لوگ ہیں لیکن اکثریت اسماعیلیوں کی ہے۔ آغا خان نے علاقے کی ترقی کے لئے کئی منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔ پھلوں کے وسیع باغات ہیں۔ وہی پھل جو پہلے ذرائع نقل و حمل کے فقدان کے باعث ضائع ہو جاتے تھے اب ملک کے کونے کونے میں پہنچتے ہیں۔ ٹراؤٹ مچھلی کی بہتات ہے۔ اس کی افزائش کے لئے کئی مرکز بھی قائم کیے گئے ہیں۔ گلگت سے کچھ فاصلے پر ایئر فورس نے اپنا Sking Resort قائم کر رکھا ہے۔ سردیوں میں باقاعدہ ٹورنامنٹ ہوتا ہے۔ دیگر یورپی ممالک کے مقابلے میں برف کی ڈھلان کچھ اتنی بڑی نہیں ہے لیکن غنیمت ہے۔ شائقین بھی اتنی بڑی تعداد میں نہیں جاتے۔ راستے دشوار گزار ہیں۔ رہائش کا بھی کوئی معقول بندوبست نہیں ہے۔

علاقے کا سب سے مقبول کھیل پولو ہے۔ شندور کے میلے میں گلگت کی ٹیم ہمیشہ شرکت کرتی ہے اور اکثر جیت کر لوٹتی ہے۔

کسی زمانے میں مکمل فرقہ وارانہ ہم آہنگی تھی بدقسمتی سے اب ایسا نہیں ہے۔ اکثر فسادات ہوتے رہتے ہیں۔ قیمتی جانوں کے ضیاع کے علاوہ کبھی نہ ختم ہونے والی تلخی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

گلگت سے چالیس میل کے فاصلے پر ہنزا ہے۔ پہاڑوں اور ہریالی کے سمندر میں گھرا ہوا خوبصورت قصبہ۔ یہ دریائے ہنزا کے کنارے آباد ہے۔ تیسرے دن ہم وہاں گئے۔ پرنس آف ہنزا نے ایک خوبصورت ہوٹل بنوایا ہے جو گلگت ہوٹل کی نسبت کہیں بہتر ہے۔ گرمیوں کے موسم کے باوجود وہاں رات کو سخت سردی پڑتی ہے۔ ہم نے ہنزہ فورٹ دیکھا۔ اس کی دہلی لاہور کے قلعے جیسی سج دھج تو نہیں ہے لیکن اسے دیکھ کر والئی ہنزہ کی عسکری قوت اور مالی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ اتنے دُور دراز علاقے میں کسی نے کیا فوج کشی کرنی تھی، اس لئے قلعہ بھی اسی حساب سے بنا ہے۔

رات کو والئی ہنزہ سے ملاقات ہوئی۔ ہوٹل کے قریب پہاڑ کی چوٹی پر اس کا محل ہے۔ اسے ایک خوشنما بنگلہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ پرانا فرنیچر، بوسیدہ پردے، گھسے ہوئے صوفے، پرانے لیکن قیمتی قالین۔ پرنس جہانزیب نے ہماری چائے سے تواضع کی۔ گارڈن کالج میں وہ میرا ہم عصر تھا۔ وائلن بڑی اچھی بجاتا تھا۔ رات کافی دیر تک والئی ریاست سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ بھی دیگر والیان ریاست کی طرح شاکی تھا۔ حکومت نے ریاست تو لے لی لیکن معقول وظیفہ نہ دیا۔

کہنے لگا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ سابق والئی ریاست چھوٹا سا ہوٹل چلا کر گزر اوقات کر رہا ہے۔ حکومت نے چین کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لئے اتنی طویل شاہراہ تو بنا دی لیکن چراغ تلے اندھیرا رہا۔ اس شاہراہ کے کنارے بسنے والوں کا کچھ خیال نہیں کیا۔ سو سال پرانے مکان میں رہ رہا ہوں۔ ایک ماڈرن بنگلہ نہیں بنوا سکتا۔ اسلام آباد میں بھی ایک گھر ہے بیشتر وقت وہاں گزرتا ہے۔ بچے یہاں مستقل سکونت رکھنے کے لئے تیار نہیں۔ وہی لوگ جن کے پاس ادب سے سر جھکے رہتے اور نگاہیں اوپر نہ اٹھتی تھیں اب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں۔ جو لوگ چند دنوں کی تفریح کے لئے آتے ہیں وہ تو اسے جنت ارضی سمجھتے ہیں لیکن یہ ایک ایسی جنت ہے جس میں کوئی چیز مفت نہیں ملتی۔ زر کثیر خرچ کرنا پڑتا ہے یہاں کوئی کلب نہیں ہے، ڈھنگ کا سینما ہاؤس نہیں بن سکا، کوئی فائیو سٹار ہوٹل نہیں بن پایا۔ ثقافتی طائفے نہیں آتے، محفل موسیقی منعقد نہیں ہوتی علمی اور ادبی بحثیں اور مناظرے نہیں ہوتے۔ کتنا عرصہ آدمی مست ہواؤں میں گھوم سکتا ہے، ندی کی موسیقی سے دل بہلا سکتا ہے۔ کنار آب رکناباد پر لکھا تو بہت کچھ جا سکتا ہے، زیادہ دیر تک رہائش اختیار نہیں کی جا سکتی۔ پھر ہر وقت قافلہ بہار ہی خیمہ زن نہیں ہوتا۔ زمستاں کا موسم شروع ہوتے ہی ہر چیز خاموشی کی دبیز چادر اوڑھ لیتی ہے۔ چار سو برف کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یخ بستہ تیز ہوائیں ہڈیوں کے گودے تک میں اُتر جاتی ہیں۔ دختر دہقان نے گیت تو کیا گانا ہے آواز بھی مشکل سے حلق سے نکلتی ہے۔

پرنس کی باتوں میں بڑا درد تھا، دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں۔ کوئی عام شخص اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ ایک سابق والئی ریاست کے لئے بھی معیشت ایک مسئلہ بن سکتی ہے۔ شاہ تو ختم ہو گئے ہیں لیکن ہمارے شعرا کو سطوت کے نشان ہنوز نظر آ رہے ہیں۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم انہیں معاف کر دیں۔ مظالم کی سزا تو اس کارساز نے دینی ہے جس کا سب جہانوں پر راج ہے۔

ہوٹل میں چونکہ سنٹرل ہیٹنگ سسٹم نہیں تھا اس لیے رات کمبلوں میں ہانپتے کانپتے کٹی۔ صبح بمشکل شیو کی، ٹھنڈے پانی سے نہانا ممکن نہ تھا۔ ہم خنجراب پاس کے لیے روانہ ہوئے تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ سڑک دریائے ہنزا کے دائیں کنارے پر چلتی ہے۔ راستے میں سست کی کسٹم پوسٹ ہے۔ کسٹم کلکٹر طاہر نے اپنے رفقا کو کہہ کر چائے کا بندوبست کرایا تھا واپسی پر لنچ بھی ہم نے وہیں کرنا تھا۔ ان کا رہن سہن اور آؤ بھگت دیکھ کر اندازہ ہوا کہ فضل ربی کہیں بھی ہو سکتا ہے جگہ کی قید کسٹم والوں کے لئے کچھ معنی

نہیں رکھتی۔

خنجراب پاس سے ۵ میل پہلے عمودی چڑھائی شروع ہو جاتی ہے۔ دریا بھی رخ بدل لیتا ہے۔ سڑک خاصی کشادہ ہے۔ جب ہماری گاڑی کسٹم پوسٹ پر رکی تو اتر کر چار سو دیکھا۔ حیرت اور خوشی یکجا ہو گئیں۔ ہم سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر کھڑے تھے۔ چار سو برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ سنتریوں کی طرح ایستادہ تھے۔ سڑک مکمل طور پر تو برف سے نہ ڈھکی تھی لیکن جگہ جگہ برف کے منطقے نظر آئے۔ ہم نے اُترتے ہی وہ کام شروع کر دیا جو کالج کے لڑکے کرتے ہیں۔ ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینکنا کچھ لڑکوں نے تو گولے پھینکنے کے ساتھ ساتھ انہیں چوسنا بھی شروع کر دیا۔ پہاڑ پر بے شمار مارخور پھرتے ہوئے نظر آئے۔ چولستان کی طرح ان کا بے دریغ قتل عام ممکن نہیں ہے کیونکہ بھاگنے کے راستے مسدود ہیں۔ یورپ سے جو شکاری آتے ہیں انہیں بھی محدود پیمانے پر شکار کی اجازت ہے۔ دس ہزار ڈالر دے کر شکار کا لائسنس بنتا ہے اور اس کی رُو سے صرف ایک Ibex مارنے کی اجازت ہے۔ ایک فائر سے سارا پہاڑ گونج اُٹھتا ہے اور اس کی صدائے بازگشت میلوں دُور تک سنائی دیتی ہے۔

حیرت کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ہم نے واہگہ بارڈر پر بالکل مختلف قسم کے مناظر دیکھے تھے۔ دیوہیکل مچھندر ۲ فٹ کے طرے والی پگڑیاں باندھے بھاری وزنی فوجی بوٹ پہنے، پھنکارتے فیل بے زنجیر کی طرح چنگھاڑتے، فاں فاں شاں شاں کرتے ایک دوسرے کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے۔ ڈکراتے، بھنبھناتے، جوان، سلطان راہی کی طرح قدم مار کر دھرتی سے پانی نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے۔ اگر دلی اس طرح فتح ہو سکتا تو ہم کئی بار کر چکے ہوتے۔ ان کی ہر حرکت پر تماشائی اللہ اکبر کے نعرے بلند کرتے۔ پاکستانی مسلمان ہر چیز برداشت کر سکتا ہے لیکن اسلام کو خطرے میں نہیں دیکھ سکتا۔ دوسری طرف سے بھی جے رام جی کے نعرے سنائی دیتے ہیں لیکن ان میں وہ جوش خروش نظر نہیں آتا جن کا مظاہرہ ہماری طرف سے ہوتا ہے۔ کم از کم ہم تو یہی سمجھتے ہیں۔

پاک چائنہ بارڈر پر دونوں طرف سے گارڈ بغلگیر ہو رہے تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اکٹھے چائے پی رہے تھے۔ ہمیں بھی خیر سگالی کے جذبے کے تحت بغیر ویزے کے چین کے اندر ایک میل تک جانے کی اجازت مل گئی۔ وہاں پر چینی بارڈر فورس نے ہمیں انگور کھلائے اور چائے بسکٹ سے خاطر تواضع کی۔ واپسی پر میاں غفار کہنے لگا "اب ہم واپس جا کر قسم کھا سکتے ہیں کہ ہم چین کا دورہ کر کے آئے ہیں۔" گلگت واپس پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی۔ طویل سفر تھا لیکن رُوح کو سرشار کر گیا۔ ہم نے پاک چینی دوستی کا ہر گام پر لازوال مظاہرہ دیکھا تھا۔

سکردو: اگلے دن ہم نے سکردو کے لئے رختِ سفر باندھا۔ ایک سو ستر میل کا سفر۔

دریائے سندھ کے دائیں کنارے جو لوگ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ سندھ کو Mighty Indus کیوں کہا جاتا ہے وہ ایک بار ان علاقوں کا دورہ ضرور کریں۔ پانی اس قدر سرعت رفتار سے چلتا ہے کہ اس کی دھمک سے سارا پہاڑ ہلتا اور کانپتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ چونکہ قومی نکتہ نظر سے اہم سڑک ہے اس لئے اس کو بھی فوج نے دو رویہ کر دیا ہے۔ شہر سے نکلے ایک گھنٹہ ہوا ہوگا کہ ڈرائیور نے گاڑی کھڑی کر دی۔ بولا" نیچے اُتر کر دیکھیں۔ دنیا کے تین عظیم پہاڑ ہمالہ، کوہ ہندوکش اور قراقرم گلے مل رہے ہیں۔ یہ پربتوں کا سنگم ہے۔ ان کی چوٹیوں پر دیو اور پریاں رہتی ہیں۔ چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر نیچے اُتر آتی ہیں اور دریا میں اشنان کرتی ہیں۔ آج چاند کی چودھویں ہے اگر آپ میں سے کوئی چاہے تو رات یہیں بسر کر سکتا ہے۔ پریوں کو برہنہ حالت میں نہاتے دیکھ کر ایک وجد کی سی کیفیت طاری ہوتی ہے اور سارے وجود میں پھلجھڑیاں سی پھوٹتی ہیں۔

"مجھے اُتار دو" رائے اعجاز کہنے لگا "آج کسی نہ کسی پری سے میری ملاقات ہو ہی جائے تو بہتر ہے۔"

"بھول کر بھی یہ غلطی نہ کرنا" میاں غفار نے مشورہ دیا۔ "پریوں نے تو تمہیں بچہ سمجھ کر لفٹ نہیں کرانی اگر کسی دیو کے ہتھے چڑھ گئے تو....." اس نے فقرہ نامکمل چھوڑ دیا۔

راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ ایک طرف بلند و بالا پہاڑ، دوسری جانب چنگھاڑتا بڑے بڑے پتھروں کو ریزہ ریزہ کرتا ہوا دریا۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں ہے لیکن نہ تو اس میں نہایا جا سکتا ہے اور نہ کشتی کے ذریعے عبور کیا جا سکتا ہے۔ پل بھی زیر کثیر خرچ کیے بغیر نہیں بن سکتے۔ مقامی لوگ رسے کے ذریعے نقل و حرکت کرتے ہیں۔ کناروں پر دو مضبوط پول گاڑ کر ان سے مضبوط رسے باندھ دیے جاتے ہیں۔ لکڑی کے پھٹوں کو جوڑ کر ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم بنایا جاتا ہے اس پر بیٹھ کر لوگ سفر کرتے ہیں۔

راستے میں ہم ایک جگہ لنچ کے لئے رُکے۔ چھوٹا سا ریسٹورنٹ تھا، کھوکھا نما۔ شاہد مجید نے سپیشل ڈش کا آرڈر دیا۔ دال چنا۔ پہاڑ پر ایک تو گوشت ملتا نہیں ہے پھر اس قسم کے ہوٹلوں میں کوالٹی بھی ٹھیک نہیں ہوتی۔ کھانا تیار ہونے میں کچھ دیر تھی۔ شاہد رشید کہنے لگے "چلو پہاڑ سے نیچے اُتر کر دریا کی جولانیاں دیکھتے ہیں۔" خوش قسمتی سے سڑک اور دریا کے درمیان گھنے درخت اُگے ہوئے تھے اس لئے ہمیں نیچے اُترنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ غالباً ہوٹل بھی اسی قسم کی موزوں جگہ دیکھ کر بنایا گیا تھا۔ مالک کو علم تھا کہ کھانے میں ذرا سی بھی تاخیر ہو تو گاہک سٹپٹا جاتا ہے، کچھ تو بیچ پاتک ہو جاتے ہیں۔ اس نے ان کی توجہ دوسری طرف مبذول کرانے کا نادر طریقہ سوچا تھا۔ پہاڑ۔ درختوں کا جھنڈ اور نیچے

دھاڑتا ہوا دریا۔ رجز کے انداز میں پہاڑی گیت گاتا ہوا۔

"اس وقت تو بڑا اترا رہا ہے" رشید صاحب کہنے لگے "ذرا اسے پہاڑ سے نیچے تو اُترنے دو۔ سمندر تک پہنچتے پہنچتے سب شوخی اُتر جائے گی۔ پانی کی ایک پتلی سی لکیر بن جائے گا جس کو سمندر ہڑپ کر لے گا۔ اس کی شوخیاں، شرارتیں اور شفافیت سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ یہی حال ہماری زندگی کا ہے۔ جوانی میں جب خون رگوں میں اسپ تازی کی طرح دوڑتا ہے تو ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا ہماری مٹھی میں ہے۔ زمین پر اکڑ اکڑ کر چلتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے حوادث زمانہ کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے تو وہ بند مٹھی کھلنا شروع ہو جاتی ہے۔"

"کاش دریا آپ کی نصیحت آموز باتیں سن سکتا تو اس قدر ڈفڈفہ، ڈائیں ڈائیں، ڈینگ ڈگار نہ کرتا۔" میں نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا۔

کہنے لگے "تمہیں تو شاعری سے بڑا شغف ہے، غالب کے پرستار ہو، جوانی میں کوئی گوش نصیحت نیوش نہیں ہوتا، کوئی آنکھ عبرت نگاہ نہیں ہوتی۔"

ہم ایک چٹان پر بیٹھ گئے اور جوتے اُتار کر پاؤں دریا میں ڈال دیے۔ ایک عجیب قسم کی آسودگی کا احساس ہوا۔ ٹھنڈا پانی، مست ہوا، تمام فضا جنگلی پھولوں کی خوشبو سے مہکی ہوئی، مویشیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی صدا، کچھ دیر ہم آنکھیں بند کیے چپ چاپ بیٹھے رہے۔

"یہ لوگ کس قدر خوش قسمت ہیں۔" شاہد رشید نے خاموشی کا طلسم توڑتے ہوئے پہاڑ پر بنے ہوئے اکا دکا جھونپڑوں کی طرف اشارہ کیا۔

"خواہشات محدود ہیں، خالص غذا کھاتے ہیں۔ دودھ، دہی، گھی، شہد، یہ جگہ ماحولیاتی آلودگی سے یکسر پاک ہے، ٹریفک کا شور نہیں ہے، گاڑیوں سے اُٹھتے ہوئے مضر صحت دھوئیں کے بادل کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ہوس زر کی میراتھان ریس میں شامل نہیں ہیں شاید خواہش بھی نہیں رکھتے۔ حسد، بغض، عناد، سازش، ریا اور فریب کے جذبات بھی صرف پڑھے لکھے لوگوں میں پنپتے ہیں۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہے کہ کون سی پارٹی برسر اقتدار آتی ہے، کون سا لیڈر ارب پتی بن گیا ہے۔ دولت کے انبار کن خاندانوں نے لگائے ہیں، وزارتوں کی جستجو میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، بے غیرتی کو کتنے ریشمی لبادے اوڑھنا پڑتے ہیں، ضمیر کو کس طرح تھپکیاں اور لوریاں دے دے کر سلایا جاتا ہے۔ وہاں کا انسان ہر وقت حالت جنگ میں رہتا ہے۔ اقتدار کی جنگ، پیسے کی لڑائی، ابن الوقت کو مسلسل ذہنی دباؤ کی وجہ سے مختلف قسم کی بیماریاں آن گھیرتی ہیں۔ ذیابیطس، بلڈ پریشر، اختلاج قلب، ضعف بصارت، اس کے مقابلے میں ذرا اس ماحول کو تو دیکھو۔ ہواؤں میں فرانس کے کلونوں سے بہتر خوشبو رچی بسی ہے گرد و غبار اور دیگر

ماحولیاتی کثافتوں کا نام و نشان تک نہیں ہے، پانی یہاں شیشہ لگتا ہے۔ ہر گھونٹ آب حیات ہے اگر مذہبی لوگوں کے فتوے کا ڈر نہ ہوتا تو میں برملا کہتا کہ حضرت خواجہ خضر یہیں کہیں پانی پی کر امر ہو گئے تھے۔ پتہ نہیں غالب کو ان سے کیا بیر تھا کہ ان کی حیات جاوید کو Asset نہیں بلکہ Liability بنا ڈالا۔

عرض کیا "شاعر ایک اعتبار سے مجذوب بھی ہوتا ہے۔ جذب کی حالت میں بہت کچھ کہہ جاتا ہے۔ دراصل وہ عظمت انسان کا قائل تھا۔ باقی رہی بات ایک پرسکون زندگی گزارنے کی تو اس سلسلے میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دُور کے ڈھول سہانے لگتے ہیں۔ خوف انسان کا پرانا ساتھی ہے یہ مرنے تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ انہیں ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے کہ جنگلی بھیڑیا، کوئی بھیڑ بکری اُٹھا کر نہ لے جائے۔ یہی چند مویشی ان کا سرمایہ ہیں بینک بیلنس ہیں، اور زندگی گزارنے کا ذریعہ بھی۔ بدقسمتی سے کوئی بیمار پڑ جائے تو ہسپتال نہیں ہے۔ حکیموں اور ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لینا پڑتا ہے بالفرض بیماری طوالت اختیار کرے تو وہ موت کا پروانہ لے کر آتی ہے۔ ان کے کھیت میں لیکن پانی نہیں ہے۔ دریا کے ہوتے ہوتے بھی وہ پیاسے رہتے ہیں۔ پانی پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتا بروقت بارش نہ ہو تو قحط سالی گھر بار چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ خاک نشین ہیں ان کا اوڑھنا بچھونا ارض خدا ہے۔ آپ ایک دن اس تنگ و تاریک کٹیا میں سو کر تو دیکھیں روم کے پانچ سالہ عیش و عشرت کو بھول جائیں گے۔ شاعروں نے ایسی جگہ رہنے کی جس خواہش کا اظہار کیا ہے وہ سب شاعرانہ تعلیاں ہیں۔ غالب نے یقیناً بے در و دیوار گھر میں رہنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا بیمار پڑنے کی صورت میں تیماردار اور مرنے کے بعد نوحہ خوان کی ضرورت محسوس نہ کی تھی، یہ سب کہنے کی باتیں تھیں اسے فوراً ہی غریب الوطنی کا احساس ہو گیا اور کہہ اُٹھا:

کون جائے غالب دلی کی گلیاں چھوڑ کر

ہم باتیں کر رہے تھے کہ اُوپر سے بلاوا آ گیا انسانی آواز تو ہم تک پہنچ نہ سکتی تھی۔ اس لئے ہوٹل کے مالک نے بس کا ہارن بجوا دیا۔ جب ہم ہوٹل میں پہنچے تو یاران تیز گام دال کی کھال اُدھیڑ رہے تھے۔ ہم بھی اُس کار خیر میں شریک ہو گئے۔

جب سکردو پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ شہر کے مضافات شروع ہوئے تھے کہ ایک اور فوکر سے ملاقات ہو گئی۔ پائلٹ نے جہاز رن وے پر اُتارنے کے بجائے ریت پر اُتار ڈالا تھا۔ سواریاں تو بچ گئیں لیکن جہاز بحق دریا ضبط کر لیا گیا۔ اس کا انجر پنجر ڈھیلا ہو گیا تھا اور اُڑنے کے قابل نہ رہا تھا۔ اس شام ہم شہر نہ دیکھ سکے۔ کوچ ایک جھٹکے کے ساتھ دائیں ہاتھ مڑ گئی۔ ایک میل کے فاصلے پر شنگریلا ہوٹل تھا اور شاہد مجید نے یہ

کمال شفقت ہماری رہائش کا بندوبست وہیں کیا تھا۔ پنڈی میں جگہ جگہ شنگریلا کے اشتہار لگے ہوئے تھے ۔ اگر آپ نے Heaven on earth دیکھنا ہو تو شنگریلا میں قیام کریں جس نے شمالی علاقہ جات کے حسن کو چار چاند لگا دیے ہیں۔

شنگریلا بریگیڈیئر اسلم کے تخیل کی پیداوار اور خواب کی تعبیر ہے۔ بریگیڈیئر اسلم ایئر مارشل اصغر خان کا چھوٹا بھائی تھا۔ ایک بھائی کوچہ سیاست میں برس ہا برس رہ کر بھی ناکام رہا اور دوسرے نے جنگلوں میں انوکھی دنیا آباد کر ڈالی۔ پتہ نہیں کب اور کیسے اسے خیال آیا کہ پاکستان کے دُور دراز علاقوں میں بھی ایک خوبصورت دنیا آباد کی جا سکتی ہے۔ سکردو سے پانچ میل کے فاصلے پر دریائے سندھ سے ذرا ہٹ کر قدرتی جھیل ہے۔ بریگیڈیئر صاحب نے اس کے کنارے ہوٹل بنایا۔ جھیل کے تین اطراف گھنے جنگل والے پہاڑ کھڑے ہیں اور چوتھی سمت دریائے سندھ بہتا ہے ۔ ہوٹل سے ملحقہ پہاڑیوں پر کھڑے ہو کر نیچے نگاہ ڈالیں تو ساری وادی دلفریب منظر پیش کرتی ہے۔ جھیل کے اندر ریسٹورنٹ بنایا گیا ہے جسے ایک پگڈنڈی کے ذریعے ہوٹل سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ ریستوران دُور سے بالکل پگوڈا لگتا ہے۔ اس کے اندر بیٹھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آدمی بادبانی کشتی میں بیٹھا ہوا سطح آب پر ہچکولے کھا رہا ہو۔

آج بریگیڈیئر اسلم نہیں ہے لیکن اس کا نام زندہ ہے۔ وہ شمالی علاقہ جات کا بے تاج بادشاہ تھا۔ فوج کی نوکری سے فراغت کے بعد عمر عزیز کا بقیہ حصہ انہی دُور افتادہ علاقوں میں گزار دیا۔ وہ تو خنجراب پاس کی چوٹی پر بھی ایک ہوٹل بنانا چاہتا تھا لیکن حکومت نے اجازت نہ دی۔ پربتوں سے عشق نے اس کی خانگی زندگی کو خاصا متاثر کیا۔ وہ خود تو ویرانوں میں زندگی گزار رہا تھا لیکن اس کی بیگم نواب زادی فریدہ بیگم نے لاہور میں ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ اسے گھوڑوں کا شوق تھا۔ ہر ریس میں اس کے گھوڑے دوڑتے، جم خانہ کلب کی ممبر تھی، برج کی رسیا، اس لئے اس سے اکثر ملاقات ہو جاتی۔ دور افتادگی کی وجہ سے میاں بیوی کے تعلقات میں خاصی سرد مہری آ چکی تھی۔ فریدہ کے لئے جنگلوں میں زندگی گزارنے کا تصور ہی سوہانِ روح تھا۔ وہ ہائی سوسائٹی کی دلدادہ تھی، نت نئے فیشن کرتی، لباس کی تراش خراش کا کافی خیال رکھتی۔ شکل وصورت بھی اچھی تھی مداحوں کی طویل فہرست ہمیشہ اپنے پرس میں رکھتی نواب زادی جو تھی۔ خاصی جائیداد کی مالک، اس لئے ہر کوئی اسے جھانسہ دینے کی کوشش کرتا۔ کلب کے پیشہ ور جمبلرز بڑی شدت سے اس کی آمد کا انتظار کرتے۔ کئی لوگوں کے ڈیرے اس کے پیسوں سے چل رہے تھے۔ آخری دنوں میں بیمار ہوئی تو بچوں کے اصرار پر شنگریلا چلی گئی لیکن زیادہ دیر تک دور افتادگی کا کرب برداشت نہ کر سکی اور وہیں ایک دن ابدی نیند سو گئی۔

[جاری ہے۔]

غزل (سراج اورنگ آبادی علیہ رحمہ کے لیے)

کوئی زخم بھی نہ ہرا رہا، کوئی آنکھ بھی نہ بھری رہی
نہ الم کشوں کی صفیں رہیں، نہ بساطِ نوحہ گری رہی

وہ جو اہلِ غم کا نصاب تھی، وہ جو تیرے رخ کی کتاب تھی
مجھے رات تکیۂ خواب تھی، تہِ سر دھری تو دھری رہی

ترا ننگ، رنگِ جمال تھا، ترا عیب، حسنِ کمال تھا
تجھے فکرِ جلوہ گری رہی، مجھے فکرِ بخیہ گری رہی

کوئی پائمالِ وصال تھا، کوئی دوریوں میں نڈھال تھا
مرے تند خو ترے روبرو مری ڈھال بے سپری رہی

کہیں ذکرِ ہجر و وصال تھا، کہیں ماتمِ سن و سال تھا
مرا غم، گرفتہ سری رہی، مرا دکھ، شکستہ پری رہی

میں سوادِ عشق میں زیر تھا، مرا قصر، راکھ کا ڈھیر تھا
مرا تخت بے ہنری رہی، مرا تاج بے ہنری رہی

کہیں بحثِ بود و نبود کی، کہیں جرحِ وہم و وجود کی
بہ ہوائے نام وری چلی، بہ لباسِ دیدہ وری رہی

مرا عشق حجلۂ یار تھا، کہ دیارِ بوس و کنار تھا
نہ وہ تیری جلوہ گری رہی، نہ وہ میری خیرہ سری رہی

نہ وہ تیرے گاؤں سی چھاؤں تھی نہ وہ تیرے روپ سی دھوپ تھی
کوئی ساتھ بھی ابدی نہ تھا، مرے ساتھ در بدری رہی

مرا ہم قدم، مرا ساتھ تھا، مرے ہاتھ میں مرا ہاتھ تھا
نہ خرد کی راہ بری ملی، نہ جنوں کی ہم سفری رہی

رخِ آب تھا کہ سراب تھا، پسِ پردہ تب و تاب تھا
طلبِ ہنر نہ رہی، مگر جلبِ کرشمہ گری رہی

نہ اٹھی اٹھائے بساطِ دل، پلٹ اے ہوائے نشاطِ دل
لبِ سرخ کھل، سرِ فرشِ گل کوئی پنکھڑی نہ ہری رہی

پرِ کاہ راہِ خیال ہوں، سرِ دوشِ بادِ جمال ہوں
نہ مری گرفتہ سری رہی، نہ مری شکستہ پری رہی

خالد احمد

غزل

وہاں معیار رکھی ہیں زبانیں
بلندی پر جہاں ہوں گی اذانیں

ہمیں اعزاز بخشا جس نے فن میں
اسے ہم دیوتا کیسے نہ مانیں

چلو زخموں کے موتی ڈھونڈتے ہیں
ارادہ ہے کسی صحرا کو چھانیں

نکالے کون ، اک مدّت سے ہم نے
سمندر میں ڈبو رکھی ہیں جانیں

رکھو قائم تم اپنی تازگی کو
بہت مدھم ہوئی جاتی ہیں شانیں

ذرا آواز کا انداز بدلیں
بہت اونچی نہ رکھیں آپ تانیں

لہو مزدور کا ہوتا ہے کالا
جلا کے کوئلہ کرتی ہیں کانیں

وفا کے معرکے ایسے ہیں ثاقب
بِنا تیروں کے چلتی ہیں کمانیں

آصف ثاقب

غزل

اِس شرطِ انتخاب سے کوئی مفر نہیں
یا شعلۂ زباں نہیں یا بُرجِ سر نہیں

دل پھاڑتے ہیں خوں میں نہائے غزہ کے عکس
محرومِ نور ہیں وہ نگاہیں جو تر نہیں

یہ شانِ امتیاز بھی قدرت کی ہے عطا
انسان ہی نہیں جسے اندر کا ڈر نہیں

کچھ اور سطحِ دید و بصیرت بلند کر
تجھ کو گماں ہوا جو ، اشارہ اُدھر نہیں

اتنی بھی اپنے ساتھ کھلی دشمنی نہ کر
الزام اپنے جرم کا اوروں پہ دھر نہیں

لینا ہے مجھ کو اپنے کچھ ایسے گُنوں سے کام
میرے عدو کو جن کی ذرا بھی خبر نہیں

عالی یہ سوچ سارے محاسن کے باوجود
کیا شے ہے کم کہ تیرے سخن میں اثر نہیں

جلیل عالی

غزل

اپنے دن رات عجب تھے، جب تھے
ہوش پیمانہ طلب تھے، جب تھے

ویسے دن رات ہی اب ہیں، جب ہیں
ایسے دن رات ہی تب تھے، جب تھے

اب نہیں ہیں تو نہیں ہیں، مانا
ہم تو ہر پل کی طلب تھے، جب تھے

دن گزرتا رہا سورج کی طرح
چاند سی رونقِ شب تھے جب تھے

اپنا سایہ بھی نہیں تم بھی نہیں
ایسی تنہائی میں کب تھے، جب تھے

اب نہیں ہیں تو نہیں ہے کوئی
اپنے احباب میں سب تھے، جب تھے

حرف سے سیکھا ہے زندہ رہنا
سانس جینے کا سبب تھے، جب تھے

حسن میں اور سی رعنائی تھی
عشق کے ڈھنگ غضب تھے، جب تھے

اب ہمیں کون کہے شیریں سخن
جب میسر ترے لب تھے، جب تھے

رات آنکھوں میں گزرتی ہے کنور
خواب سرمایۂ شب تھے، جب تھے

اعجاز کنور راجہ

غزل

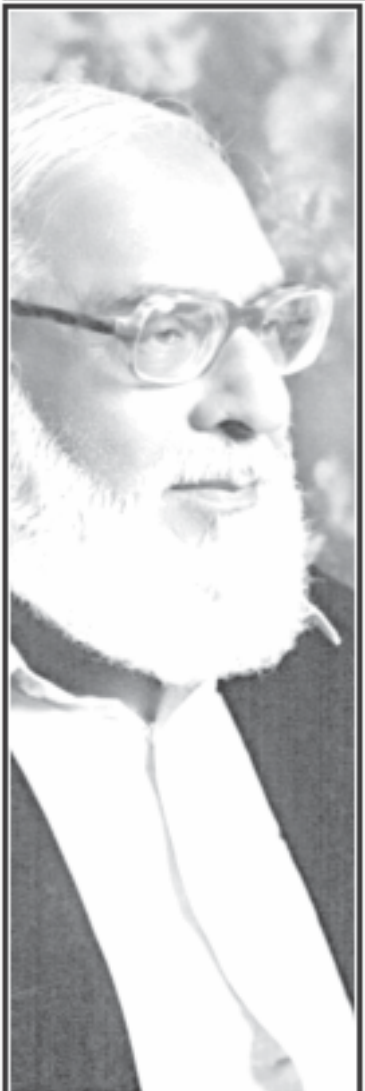

راستے تیرگی سے کٹ جائیں
راہِ روشن پہ لوگ ڈٹ جائیں

من کی دنیا میں روشنی کر دیں
تن کثافت سے جبکہ اٹ جائیں

آ رہی ہے بہار جاں افزا
سائے فصلِ خزاں کے چھٹ جائیں

جانے منزل پہ کون پہنچے گا
ہم اگر راستوں میں بٹ جائیں

ہے یہ اعجاز ، زورِ ایقاں کا
اک اشارے سے بحر پھٹ جائیں

جراتوں کو جو ہم عناں کر لیں
کھائیاں ظلم کی بھی پٹ جائیں

آ گیا ہے ریاض جوبن پر
بے ہنر راستے سے ہٹ جائیں

سید ریاض حسین زیدی

غزلیں

ہمیں چرکے لگائے دوستوں نے مہرباں ہو کر
زمیں آئی ہمارے سر پہ گویا آسماں ہو کر

یہی انجام ہونا تھا بالآخر جوشِ وحشت کا
اُڑا پھرتا ہے اَب دامن ہمارا دھجیاں ہو کر

جہانِ بے اماں کی ٹھوکریں کھانے سے بہتر ہے
پڑے رہیے کسی کے در پہ سنگِ آستاں ہو کر

نتیجہ سنگ زادوں سے ہماری دوستی کا ہے
گرا ہے دُور تک آئینہ خانہ کرچیاں ہو کر

بقول اکبر بنے گا خسروِ اقلیمِ دل اپنا
جو ہم سے گفتگو کر لیوے گا شیریں زباں ہو کر

ہَوا پامال کر دیتی ہے ہر نقشِ قدم خاورؔ
نشاں والے بھی رہ جاتے ہیں اِک دن بے نشاں ہو کر

خاور اعجاز

ہے اندھیرا مچان سے باہر
پاؤں رکھیے گا دھیان سے باہر

فکر جس کو سمیٹنے کی ہے
کچھ تو ہے آسمان سے باہر

اِن دنوں ہو رہا ہے وہ سب کچھ
جو تھا وہم و گمان سے باہر

تیغ اپنی نیام کے اندر
تیر اپنا کمان سے باہر

کب سے بیٹھی ہے منتظر میری
لامکانی ، مکان سے باہر

رازداری ہے شرط ، کیوں رکھیے
دل کا سودا دُکان سے باہر

غزلیں

خواب میں اترے مناظر کیا ہوئے
سوچ کیا تھی اور مقدّر کیا ہوئے

کشتیاں کن ساحلوں پہ رہ گئیں
تیری آنکھوں کے سمندر کیا ہوئے

آہنی دیوار کیسے گر گئی!
جو محافظ تھے وہ لشکر کیا ہوئے

جھیل جھرنے آبشاریں خشک ہیں
کوہکن تیرے صنوبر کیا ہوئے

کانپتی شاخ بریدہ رہ گئی
پیڑ تھے جتنے تناور کیا ہوئے

خاک اُڑتی ہے یہاں اب چارسُو
زندگانی تیرے تیور کیا ہوئے

زاہد فخری

نہیں کہ ہم نے اندھیروں میں ڈوب جانا ہے
سنو کہ ہم نے دیے سے دیا جلانا ہے

نہ جانے کیا میرے سینے میں ٹوٹ پھوٹ گیا
کہا جو اس نے کہیں دور اس کو جانا ہے

تو میرے سامنے ہے دسترس میں لگتی ہے
مگر جو بیچ میں اتنا بڑا زمانہ ہے

میں اس جہان میں تیرے لیے ہی آیا ہوں
یہ زندگی تو میری جان اک بہانہ ہے

کسی کا بوجھ ہے جو ہم اٹھائے پھرتے ہیں
ہمارا بوجھ کسی اور نے اٹھانا ہے

کہیں سے تیر چلے ہم کو آ کے لگتا ہے
کہ ہر کمان کو اوّل یہی نشانہ ہے

یہ عمر بھر کا سفر رائیگاں تو ہے فخری
مگر یہیں سے نیا راستہ بنانا ہے

غزلیں

جب سمندر کو بھی ہو جاتا ہے پیارا کوئی
چل کے آ جاتا ہے تب پاس کنارا کوئی
اس کی بازی میں فقط جیت لکھی ہوتی ہے
اِس محبت کے سفر میں نہیں ہارا کوئی
کتنی تاریک ہو پر راہ چمک اُٹھتی ہے
جب نئی آس دلا جائے ستارا کوئی
دیکھ لیں گے اُسے تیری نگاہوں سے کبھی
گر چھلک اٹھے گا آنکھوں سے نظارا کوئی
اتنا بے کیف تو گزرے نہ کسی کا جیون
کسی بے کس کا بھی بن جائے سہارا کوئی

شار ترابی

پھول راہوں میں بچھاؤں گا، چلا جاؤں گا
میں کوئی باغ لگاؤں گا، چلا جاؤں گا
مَیں اگر دیکھوں گا صحرا ہے، مرے رستے میں
اَبر بن جاؤں گا، چھاؤں گا، چلا جاؤں گا
روشنی جس کی اندھیروں کو نگل جائے گی
دیپ اک ایسا جلاؤں گا، چلا جاؤں گا
ایک منزل پہ کہاں رُکتا ہے دریا میرا
جب کہیں موج میں آؤں گا، چلا جاؤں گا
میں کسی در پہ نہ جاؤں گا صدائیں دینے
چپ کی دیوار اٹھاؤں گا، چلا جاؤں گا

ایک ہی شخص کی تحویل میں رکھا خود کو
ہم نے آنے نہ دیا دل میں دوبارا کوئی
ہم تمھاری ہی تمنا میں جیے جاتے ہیں
تم بھی یہ ذہن میں رکھو ہے تمھارا کوئی
کوئی چقماق اٹھا کر نہ چلے آنا تم
پیڑ کے بیچ چھپا ہو گا شرارا کوئی

تیری تنہائی کو ہم راز کروں گا ایسے
وجد میں جھوم کے آؤں گا، چلا جاؤں گا
جو کہانی کے ہر اک موڑ پہ خاموش رہا
داستاں اُس کی سناؤں گا، چلا جاؤں گا
اپنی آنکھوں سے جدا کر کے مَیں نیندیں اپنی
اپنے خوابوں کو اٹھاؤں گا، چلا جاؤں گا

غزل

کیسی مشکل ہے فاختاؤں پر
آسمانوں پہ باز اڑ رہا ہے

گھومتی ہے زمین شدت سے
سب نشیب و فراز اڑ رہا ہے

نیتیں باندھ لیں وضو کرکے
پھر سے جائے نماز اڑ رہا ہے

بندہ پرور کوئی غرور نہیں
اب یہ بندہ نواز اڑ رہا ہے

نیکیوں کا صلہ تکبر میں
سارا عجز و نیاز اڑ رہا ہے

آئینہ دیکھتا ہوں حیرت سے
عکس میں کیا مجاز اڑ رہا ہے

کیا مرے بخت کے ستاروں میں
کوئی سر بستہ راز اڑ رہا ہے

میں کہیں اور جا رہا ہوں مگر
دل تو سوئے حجاز اڑ رہا ہے

مسعود احمد

غزل

خواب ہی دیکھتی رہی آنکھیں
کسی مسافت میں رات گزری ہے

کون کہتا اکاس بیلوں سے
رُت یہ بے برگ و بار گزری ہے

راکھ کا ڈھیر ہو چکے شعلے
پر نہ یہ سرد رات گزری ہے

ہم نفس ! جس گلی سے گزرا ہوں
پتھروں کی برات گزری ہے

بجھ گئیں کیوں وہ مہرباں آنکھیں
کوئی انہونی بات گزری ہے

سب دعائیں اس ایک شخص کے نام
جس کے دُکھ میں حیات گزری ہے

محمد انیس انصاری

غزل

برگ و بار و سایۂ اشجار کا شکوہ نہیں
ہم کو ویرانے میں بھی جینے کا حق ملتا نہیں

خواہشِ آوارگی لے آئی کیسے موڑ پر
دشت بھی ہم چھوڑ آئے، شہر میں بھی جا نہیں

ظلمتوں میں روشنی دے گا تو مانیں گے چراغ
دیپ کہہ دینے سے کوئی دیپ بن سکتا نہیں

کس طرح شاخ و شجر سے رسم و رہ پیدا کریں
کل بھی موسم سرد تھا اور آج بھی اچھا نہیں

کشمکش میں ہوں کہ اب زخمِ جنوں کا کیا کروں
میں جہاں گرمِ سفر ہوں وہ مرا صحرا نہیں

زخم کیا کیا ہیں خس و خاشاک کے دل میں نہاں
در بدر پھرتی ہوا کو اس کا اندازہ نہیں

شام کے سائے بڑھے خورشید تو مجھ پر کھلا
دھوپ بھی میری نہیں ہے سایہ بھی میرا نہیں

خورشید ربانی

غزل

دریا بہت خجل ہوا دل میرا توڑ کر
پانی نکال لایا میں پتھر نچوڑ کر

وہ جا رہی تھی منزلِ بے سمت کی طرف
مشکل سے رہ گزر کو میں لایا ہوں موڑ کر

اب گھر کو لوٹنے کا کوئی راستا نہیں
باہر نکل گیا تھا میں دیوار توڑ کر

شاید یوں اس کو ہجر کے غم کا یقین ہو
رکھ دی ہیں اس کے سامنے آنکھیں نچوڑ کر

اب میں اسی چٹان کی مانند سخت ہوں
آیا تھا ایک روز میں سر جس سے پھوڑ کر

میں دے رہا ہوں اس لیے تعبیر کا فریب
ایسا نہ ہو کہ خواب چلے جائیں چھوڑ کر

یہ خواہشیں تو اوجِ فلک تک چلی گئیں
رکھتا گیا تھا میں انہیں آپس میں جوڑ کر

کروا رہا ہے وہ مجھے بارش کا انتظار
میں جس کے ساتھ آ گیا دریا کو چھوڑ کر

طالب انصاری

غزل

داستاں غم کی سنی جائے جہاں سے اس کی
فرش تا عرش دہل جائے فغاں سے اس کی

تیر کی طرح سے پیوست ہوا ہے دل میں
وہ جو اک لفظ سا نکلا ہے زباں سے اُس کی

اُڑ گئے سارے پرندے انھیں ادراک ہوا
تیر اب تک نہیں نکلا ہے کماں سے اس کی

ایک مدت ہوئی اس دشت کو وہ چھوڑ گیا
یاد اب تک نہیں نکلی ہے مکاں سے اس کی

وہ جو اشیا میں محبت کی ملاوٹ بیچے
بھیڑ کچھ کم نہیں ہوتی ہے دکاں سے اس کی

عشق کا پیڑ جہاں خشک ہوا ہے اجمل
کونپلیں پھر نئی پھوٹی ہیں وہاں سے اس کی

اجمل اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آواز کا جادو بھی جگانے نہیں دیتے
چڑیوں کو وہ اَب شور مچانے نہیں دیتے

غزل

میری تنہائی کو بہلانے چلے آتے ہیں
سائے سے جو در و دیوار پہ لہراتے ہیں

آپ کو پھر کہیں خفت نہ اٹھانی پڑ جائے
کس لیے بیتی ہوئی باتوں کو دہراتے ہیں

اس محبت نے اجاڑے ہیں بہت سے کنبے
اپنا یہ فرض سمجھ کر تمھیں سمجھاتے ہیں

زندگی کیسے بسر ہوگی جناب واعظ
مان جاؤں میں اگر آپ جو فرماتے ہیں

وجہِ رسوائی نہ بن جائے کہیں آخری عشق
اس لیے آپ کو بس دیکھتے رہ جاتے ہیں

میرا دم بھرتے تھے ہر وقت جو پہلے راحت
آج کل بات بھی کرتے ہوئے کتراتے ہیں

راحت سرحدی

غزل

کسی نظر میں تمنا کا اضطراب نہیں
ہماری نیند کے بستر پہ کوئی خواب نہیں

ابھی سے جھیل کے پانی میں ٹمٹماہٹ ہے
ابھی تو جھیل میں اترا وہ ماہتاب نہیں

محبتوں کے شجر پر ثمر نہیں لگتا
یہ ایسی شاخ ہے جس پر کوئی گلاب نہیں

ترے بغیر خوشی کاٹنے کو آتی ہے
میں کامیاب ہوں لیکن میں کامیاب نہیں

وہ راگ ہوں جو کسی ساز تک نہیں پہنچا
وہ لفظ ہوں جو سماعت کو باریاب نہیں

وہ روشنی جو اندھیروں نے مسترد کر دی
وہ آسماں جو ستاروں کا انتخاب نہیں

وہ روشنی جو مجھے آئینہ بناتی ہے
چراغ شوق ترے ہاں بھی دستیاب نہیں

مرا خیال کسی فکر میں نہیں ڈھلتا
مجھ ایسا خواب کہیں اور دستیاب نہیں

یہ دشت زار جو پھیلا ہے چار سُو شاہد
ترے جمال کی کرنوں سے فیضیاب نہیں

افتخار شاہد

غزل

دیکھ لو ٹوٹ بکھرتی ہوئی عظمت اِن کی
ہم نے چپ چاپ سہی روح پہ نفرت جن کی

بند ہوتے ہوئے دروازوں پہ جا کُھلتی ہے
ناگہانی میں گزاری ہوئی عُجلت سن کی

امن کے قصے سناتے ہوئے تھکتے ہی نہیں
جنگ کی آڑ میں بڑھتی ہے تجارت جن کی

تو خوشی سے تھا عجب رویا کہ برسات ہنسی
جلترنگ آج بھی کانوں میں ہے اُس رکن رمن کی

آپ کی راتیں بھی روشن ہیں خیالات بھی ہیں
تیرگی آپ نے دیکھی ہی نہیں ہے دِن کی

دل کہ وحشت میں تڑپ اٹھتا ہے مچھلی کی طرح
صورتِ حال نہیں سنبھلی تمہارے بِن کی

یہ جہنم کے بیوپاری مدرس نہیں ہیں
زندگی تلخ کیے رکھتا ہے فرحت جِن کی

فرحت عباس شاہ

غزل

جانتا ہوں میں تری آنکھوں کے بھید
تیکھی تیکھی دھڑکنوں سانسوں کے بھید

میں سمجھتا ہوں تری جیتوں کے راز
جانتا ہے تو مری ماتوں کے بھید

منکشف کر یا نہ کر تیری رضا
کہتی ہے یہ چپ تری گھاتوں کے بھید

کچھ اندھیروں میں بھی ہیں اُجلے سے رنگ
کچھ اجالوں میں بھی ہیں راتوں کے بھید

جب بھی آتی ہیں وہ یادیں جھوم کر
کھولتی ہیں آنکھیں برساتوں کے بھید

ہیں خسارے ہی خسارے دُور تک
جانتا ہوں میں سبھی کھاتوں کے بھید

پیروی کر حضرتِ حسان کی
پھر کھلیں گے مدحتوں نعتوں کے بھید

ڈھونڈتے ہو کیا لکیروں میں جلیل
کہتی ہیں ریکھائیں سب ہاتھوں کے بھید

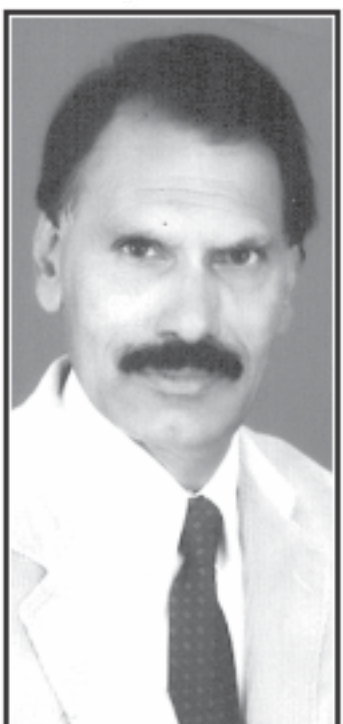

احمد جلیل

غزل

تم میرے تھے، خیال ہی آیا نہیں مجھے
اور تم نے بھی تو یاد دلایا نہیں مجھے

دیوار کو گرا کے اُٹھایا بھی میں نے تھا
دیوار نے گرا کے اُٹھایا نہیں مجھے

دل پر وہ دل نظر پڑا خود ہی پھر ایک دن
دل دے دیا اور اُس نے بتایا نہیں مجھے

اک بار میں نے آئنہ تیرے بغیر بھی
دیکھا تھا اور دیکھنا آیا نہیں مجھے

اُس کو پتا تھا میں نے جھگڑنا تو ہے نہیں
خود بن گیا ہے اور بنایا نہیں مجھے

تھا تو میں تیرا جشنِ حیات و ممات ہی
تو نے اگرچہ ٹھیک منایا نہیں مجھے

بانہوں میں آنا جانا ہے اُس کا اُسی طرح
جو دھیان میں بھی اب کبھی لایا نہیں مجھے

اے آنکھ، تُو بھی یاد رہے گی کہ تُو نے بھی!
کھویا ہے مجھ کو اور بتایا نہیں مجھے

زنجیر لازمی ہے کہ زنجیر کے بغیر
چلنا زمین پر ابھی آیا نہیں مجھے

میں خود بھی آ رہا تھا جگہ ڈھونڈتے ہوئے
یاں تک یہ انہدام ہی لایا نہیں مجھے

شاہین عباس

غزلیں

تری یادوں کا دل میں اک خزانہ بن گیا ہے
یہ ہم پیاسوں کی خاطر آب و دانہ بن گیا ہے

دھرے بازو پہ سَر آرام سے سوئے ہوئے ہو
کسی بستی میں کیا کوئی ٹھکانہ بن گیا ہے

ابھی کچھ اور مجھ کو زندگی نے دی ہے مہلت
ابھی کچھ اور جینے کا بہانہ بن گیا ہے

چھپا جو شاخ کے پہلو میں جا کر سب سے پہلے
وہی اس تیر کا آخر نشانہ بن گیا ہے

میں خاموشی سے اپنے راستے پہ چل رہی ہوں
نہ جانے کیوں مرا دشمن زمانہ بن گیا ہے

گریباں چاک جنگل میں نکل جائے تو مانیں
ہمارے عشق میں کوئی دِوانہ بن گیا ہے

ضرورت پڑ گئی تو روز ہی ملنے لگے ہیں
بہانے سے گھروں میں آنا جانا بن گیا ہے

رخشندہ نوید

گُل نے شاخوں سے پہلو باندھ لیے
پتّے پتّے نے جگنو باندھ لیے

جگمگانے کو لمحۂ شب ہجر
دونوں آنکھوں نے آنسو باندھ لیے

میری ماں کی دعا تھی یا منتر
جس نے دشمن کے جادو باندھ لیے

ایک ہلچل سی ہے خیالوں کی
دل کے جنگل میں آہو باندھ لیے

ابر کے ساتھ میں ذرا ناچی
آسماں نے بھی گھنگھرو باندھ لیے

غزل

تُکّے لگاتا ، تِکّے اڑاتا ہے یہ فقیر
دنیا کو ہیچ کر کے دکھاتا ہے یہ فقیر

یہ دشت کہکشاں کا، تری راہ کا پڑاؤ
حیرت سے جس کی خاک اڑاتا ہے یہ فقیر

سو آندھیاں ہیں پیڑ کے پیچھے لگی ہوئی
بس ان کو ہیر پھیر کے آتا ہے یہ فقیر

ہم دل زدوں سے زندگی اچھی طرح سے مل
شعلہ مزاج، روٹھ بھی جاتا ہے یہ فقیر

ہر مسئلے کے حل کو یہ آمیزہ خوب ہے
بس عین ، شین ، قاف ملاتا ہے یہ فقیر

تم کو کبھی دکھائے تو پہچان ہی نہ پاؤ
آئینے کو جو شکل دکھاتا ہے یہ فقیر

تُو ہے تو کائنات ہے، میں ہوں تو زندگی
حد سے زیادہ کچھ بڑھا جاتا ہے یہ فقیر

جو نذر بے رخی کو تری کر دیئے گئے
وہ لمحے سال کاٹ کے لاتا ہے یہ فقیر

منظر اعجاز

غزل

تلخیٔ وقت تری بات میں رہ جاتی ہے
تشنگی پھر سے مری ذات میں رہ جاتی ہے

تیری خوشبو کو ہوا سنگ اُڑا لے جائے
یاد کی تتلی مرے ہات میں رہ جاتی ہے

شام کے ڈوبتے سورج کی شفق کی مانند
اِک محبت کسی سوغات میں رہ جاتی ہے

پیار کے لمحوں سے چو گِرد سجا لیتی ہوں
اور تنہائی مری گھات میں رہ جاتی ہے

وہ زمیں کھینچتا رہتا ہے مسلسل میری
پر کمی کوئی مری مات میں رہ جاتی ہے

دیکھنے سے یہی لگتا ہے کہ چاہتا ہے مجھے
پر وہ شدت کہ جو جذبات میں رہ جاتی ہے

ہر کہانی شروع ہوتی ہے اسی شدت سے
ہر کہانی انہی حالات میں رہ جاتی ہے

شبہ طراز

غزل

اعجاز روشن

کوئی دیوار بناتا ہوا میں
اس کو تعمیر بتاتا ہوا میں

خشک دریا میں بہا جاتا ہوں
خواب میں ہاتھ چلاتا ہوا میں

اک رمق بھی نہ کہیں زندہ تھی
سو گیا سب کو جگاتا ہوا میں

اک تاسف کے دھویں میں لپٹا
اس کی تصویر جلاتا ہوا میں

کتنی راتوں کی سیاہی چاٹوں
عشق کی صبح بناتا ہوا میں

بے بسی کی کوئی تصویر لگا
غم کی بارش میں نہاتا ہوا میں

اپنی پہچان ہوئی گم روشن
بات اوروں کی سناتا ہوا میں

غزل

کردار جیسے اپنی کہانی کے ساتھ ہیں
سب رنگ زندگی کے جوانی کے ساتھ ہیں

کیا کیا مراد اِن سے ہے یہ بھی تو دیکھیے
کچھ حاشیے بھی یارو! معانی کے ساتھ ہیں

اب کے مکر نہ پائے گا عہدِ وفا سے وہ
اب کے یقین کی ہم نشانی کے ساتھ ہیں

ہر شب فقط ہمیں تو سنانی ہے داستاں
راجہ کے ساتھ ہیں نہ ہی رانی کے ساتھ ہیں

دریا کی خشک ریت ہی ماتم کناں ہے کیوں
کچھ خواب ساحلوں کے بھی پانی کے ساتھ ہیں

رنگین شام، آبِ رواں، ناؤ، مست لوگ
اے موجِ خواب! تیری روانی کے ساتھ ہیں

اُس آتشیں عذار پہ ٹپکیں گے کس گھڑی
سب اشک اپنی اپنی گرانی کے ساتھ ہیں

کل تک جو بزمِ ناز میں مسند نشین تھے
آصف وہ آج اشک فشانی کے ساتھ ہیں

محمد آصف شفیع

غزلیں

تجھ سے ہی تیری شکایت کرتے
کس طرح ہم یہ جسارت کرتے

ہم اگر ایسا کبھی کر سکتے
اپنے ہونے کی مذمت کرتے

تو نے اِک بار کہا تو ہوتا
ہم تری دل سے حمایت کرتے

ہم تھے مٹی کی محبت کے اسیر
کیسے ممکن تھا کہ ہجرت کرتے

تیری ہر یاد امانت جیسی
کس طرح اِس میں خیانت کرتے

دُکھ پہ لکھتے کوئی شہکار غزل
اَن کہے غم کو عبارت کرتے

تجھ سے ہر بار نبھاتے رشتہ
تجھ سے ہر طور محبت کرتے

طلعت شبیر

رت بدل رہی ہے کیوں؟
شام ڈھل رہی ہے کیوں؟

کیوں چھک رہے ہو تم؟
وہ مچل رہی ہے کیوں؟

روشنی بھی چاند کے
ساتھ چل رہی ہے کیوں؟

اس کے انتظار میں
شمع جل رہی ہے کیوں؟

ریت میرے ہاتھوں سے
خود پھسل رہی ہے کیوں؟

کچھ تو حوصلہ حضور
جاں نکل رہی ہے کیوں؟

زندگی کے دام میں
موت پل رہی ہے کیوں؟

غزل

تُو نے جو کچھ مرے خلاف کیا
جا محبت تجھے معاف کیا

حرف آئے گا میرے منصف پر
جب حقیقت کا اِنکشاف کیا

دل جلوں نے ٹھٹھرتی راتوں میں
تجھ کو اوڑھا تجھے لحاف کیا

خوبصورت ہے یہ جہاں تجھ سے
سارے عالم نے اِعتراف کیا

دل کا شیشہ ذرا مکدّر تھا
ہم نے پلکیں بھگو کے صاف کیا

گونگے بہرے جہان میں ہم نے
چُپ کی دیوار میں شِگاف کیا

فرقہ بندی سے ڈر کے ہم نے سحرؔ
غم کے جنگل میں اِعتکاف کیا

اکرم سحر فارانی

غزل

داستانیں نماز پڑھتی ہیں
جب وہ آنکھیں نماز پڑھتی ہیں

تیرے چہرے کی سمت قبلہ رو
چار سمتیں نماز پڑھتی ہیں

جب سے دیکھا ہے یار کا چہرہ
میری نظریں نماز پڑھتی ہیں

عشق خود سے کرے مرا معشوق
خود نمازیں نماز پڑھتی ہیں

کب یہ آنسو وضو کرائیں گے؟
کب یہ پلکیں نماز پڑھتی ہیں؟

گردشوں میں طواف یار کے بعد
کائناتیں نماز پڑھتی ہیں

ذکر کرتے ہیں جب یہ شعرا میرا
پہلے غزلیں نماز پڑھتی ہیں

دل وہ مسجد ہے جس میں پنجگانہ
آرزوئیں نماز پڑھتی ہیں

جو بھی اُٹھتی ہیں یار کی جانب
وہ نگاہیں نماز پڑھتی ہیں

ایسی بھی خود پرست ہستیاں ہیں
آئنوں میں نماز پڑھتی ہیں

حرمِ عشق کی ابابیلیں
دائروں میں نماز پڑھتی ہیں

شعر گوئی کہ عشق ہے ساگر
حمدیں نعتیں نماز پڑھتی ہیں

محمد سلیم ساگر

غزل

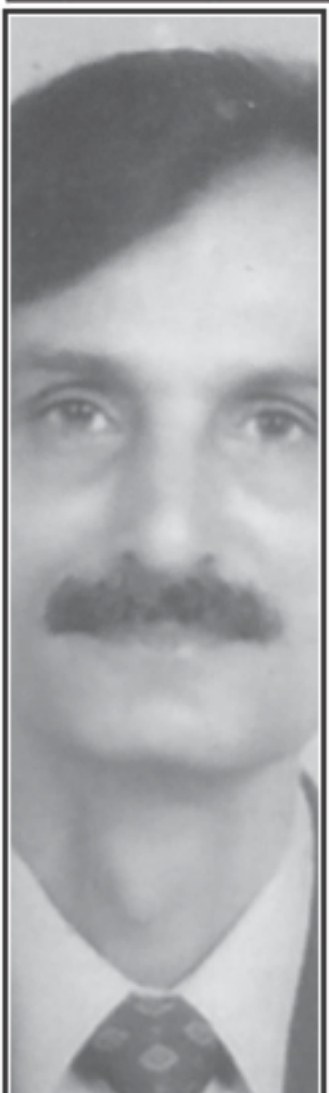

بڑھاپا اب جوانی مانگتا ہے
وفاتِ ناگہانی مانگتا ہے

اسے بھی شہر راس آیا نہیں ہے
تعلق زندگانی مانگتا ہے

اسد تو بادشہ احساس کا ہے
سبھی پر حکمرانی مانگتا ہے

ہمارے عشق کا مجنوں حوالہ
ہمیشہ سنگ خوانی مانگتا ہے

خموشی توڑ دے سب کی طرح تو
زمانہ تو کہانی مانگتا ہے

جوانی یاد آئی اس کو شاید
مری فوٹو پرانی مانگتا ہے

قبیلہ ہے مرا گاندر ارائیں
مرا فن باغبانی مانگتا ہے

مظہر امام

غزل

ہم ہیں مومن جب ہماری قبر پر جائے گی رات
دیکھ کر آلِ نبیؐ کا نور مر جائے گی رات

جھیل کے شفاف پانی سے نکھر جائے گی رات
ورنہ چہرے پر لگی کالک سے ڈر جائے گی رات

بَن کے ہالہ چاند سے چہرے کا کرتی ہے طواف
بَن کے زُلفیں آپ کے رُخ پر بکھر جائے گی رات

لے کے اپنے ساتھ جائے گی سبھی ظلمت پرست
تیرہ بختی کے سمندر میں اُتر جائے گی رات

آرزوئے دید میں سارا گزر جائے گا دن
آپ آئیں گے اگر اپنی سنور جائے گی رات

ہم اُجالوں کے پیمبر، ہم اندھیروں کے رقیب
ہم سے ٹکرائے گی تو بے موت مر جائے گی رات

ڈر نہیں ہے مجھ کو اپنی موت کا کوئی عقیل
سوچتا ہوں بعد میرے کس کے گھر جائے گی رات

عقیل رحمانی

غزل

ضرور اندر سے وہ ٹوٹا بہت ہے
کہ ہر اک بات پر ہنستا بہت ہے

اسے جینے نہیں دے گی یہ دنیا
سنا ہے ہم نے وہ سچا بہت ہے

نقابِ رخ پلٹ دی اس نے شاید
ہر اک سو چاند کا چرچا بہت ہے

کروں کس طرح میں اس کی برائی
مرے دل نے اسے چاہا بہت ہے

کوئی اس کی خبر تک بھی نہ لے گا
وہ سب سے ٹوٹ کر ملتا بہت ہے

اسے تو دوستوں پر تھا بھروسہ
مگر اس وقت وہ تنہا بہت ہے

سمجھ پائے نہ اس کو اس لئے ہم
اسے اس ذہن نے سوچا بہت ہے

ابھی شب کا اثر ہے اس پہ باقی
کہ چہرہ صبح کا اترا بہت ہے

بچو مظلوم کے اشکوں سے اب تم
یہ دریا آج کل بپھرا بہت ہے

نہیں ہے فرض چاہت میں ملن ہی
تم اپنا کہدو بس اتنا بہت ہے

مخالف اس کے بڑھتے جا رہے ہیں
یقیناً وہ "ذکی" اچھا بہت ہے

ذکی طارق

غزلیں

لاکھ پردوں میں نہاں اس کی خود آرائی ہے
اک سمندر کی طرح زیست کی گہرائی ہے

اپنے دامن کو ذرا خود ہی بچا کر چلنا
جا بہ جا بکھرا ہوا خدشۂ رسوائی ہے

خاک پر پھول کہیں تھے کہیں سوکھے پتے
میں تو سمجھا تھا کہ گلشن میں بہار آئی ہے

وہ تو ثابت ہوا کانٹوں کا بڑا سوداگر
میں سمجھتا تھا جسے پھولوں کا شیدائی ہے

راستہ دن کے اجالے میں ہوا ہے اندھا
اس قدر دھند مرے چاروں طرف چھائی ہے

مدتیں اس کی جدائی کو ہوئی ہیں طاہر
آج بھی مجھ کو فقط اس کی ہی یاد آئی ہے

طاہر ناصر علی

توڑ کر پھینکو نہ یوں راہ میں پیمانے کو
زخمی کر دے گا یہ ورنہ کسی مستانے کو

اس کے بجھتے ہی اسے چھوڑ کہ جانا نہ کہیں
ہوتی الفت جو اگر شمع سے پروانے کو

محفلِ اہلِ خرد میں وہ نہیں جا سکتا
کیسے سمجھائے کوئی بات یہ دیوانے کو

اپنی آنکھوں کے دیئے اشکوں سے روشن کر کے
ہم سجا لیتے ہیں یوں قلب کے ویرانے کو

یہ حقیقت ہے کہ تھا روکنا اس کو مقصود
طول وہ یوں ہی نہیں دیتے ہیں افسانے کو

اس کا الزام کسی اور پہ لگ جاتا ہے
قتل کر کے وہ چھپا دیتے ہیں دستانے کو

روکتا رہتا ہے واعظ ہمیں مے نوشی سے
جب کہ جاتے ہیں سبھی راستے مے خانے کو

خط میں اس نے یہی لکھا کہ بھلا دو اس کو
اس نے یوں ختم کیا پیار کے افسانے کو

ہو گئے سارے شجر چڑیوں سے خالی طاہر
بات کافی ہے یہی قلب کے تڑپانے کو

غزل

یہ جہانِ ابلہ فریب ہے، یہاں لوگ نقلِ وفا کریں
یہاں اپنی اپنی غرض لیے، سبھی دوسروں سے ملا کریں

یہ فریبِ ہستی نہیں تو کیا، کہ ہمیں تمھی سے جو عشق ہے
تمھیں اس کی کوئی خبر نہیں، یہ ہمیں کہ عشق کیا کریں

وہ جو ماہتاب جہان تھا، وہی آ کے اترا ہے صحن میں
جو عدوئے جاں ہیں، رقیب ہیں، وہ مری بلا سے جلا کریں

ہے جہاں جہانِ عمل کشاں، یہ جہان اجر و سزا نہیں
سو ہیں رستگار سبھی یہاں، وہ برا کریں کہ بھلا کریں

وہ جو دور بیٹھے ہیں بزم میں، لیے بے نیازی کی شان اک
ہے انھی سے اتنی سی التجا، کہ حدیثِ دل تو سنا کریں

تری کج ادائی کے باب میں، جو کہیں بھی ہم تو کہیں گے کیا
کہ لکھا تھا ایسا نصیب میں، سو نصیب ہی سے گلہ کریں

غمِ جان شوکتِ خستہ جاں، غمِ عشق ہی میں بدل گیا
غمِ عشق سے، غمِ جان کو، بھلا کیسے اب کے جدا کریں

شوکت محمود شوکت

غزل

حیراں ہے بادشاہ ، پریشاں ہے بادشاہ
رد عمل پہ سخت ہراساں ہے بادشاہ

بہروپیت تمام رعایا پہ کھل چکی
چھپ کر بھی اِتنے پردوں میں عریاں ہے بادشاہ

دربار احمقوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا
ان احمقوں میں سب سے نمایاں ہے بادشاہ

باہر محل کے ایک بغاوت کا شور ہے
گردوں شگاف نعروں سے لرزاں ہے بادشاہ

اس بار بیوقوف نہیں بن رہے عوام
جمہور کے شعور سے نالاں ہے بادشاہ

دیکھا جو زائچہ تو نجومی نے یہ کہا
لگتا ہے کچھ دنوں کا ہی مہماں ہے بادشاہ

شاہد ماکلی

غزل

دل پہ لاکھوں غم سہے لیکن کبھی رویا نہیں
آنسوؤں سے چہرۂ حرمت کبھی دھویا نہیں

اب تو خوابوں کی طلب میں کاٹتا ہوں زندگی
اِس لیے کہ عمر بھر میں چین سے سویا نہیں

دشمنِ جاں بھی گواہی دے گیا اِس بات کی
میں نے کانٹوں کو کسی کی راہ میں بویا نہیں

ماسوا تیرے زمانہ جانتا ہے عمر بھر
ناتواں کاندھوں پہ غم کا بوجھ کب ڈھویا نہیں

کیا خبر کس غم میں کھویا کھویا رہتا ہے وہ شخص
رہ کے محفل میں بھی میری آج کل گویا نہیں

سہہ گیا دل پر ستم ہنستے ہوئے اُس شوخ کے
ضبط لازم تھا کسی بھی حال میں رویا نہیں

اب تو محفل ہی اُجڑ کر رہ گئی اے ہم نفس!
اب مری محفل میں وہ لیلیٰ نہیں، زویا نہیں

یہ نشانی ہے جنوں کی ہر ستم کے باوجود
داغ ماتھے پر جو ہیں اشکوں نے بھی دھویا نہیں

اپنے اپنے ظرف کی باتیں ہیں یہ سن لے ندیمؔ
"تُو نے مجھ کو کھو دیا میں نے تجھے کھویا نہیں"

ریاض ندیم نیازی

غزل

زندگی یوں رکی رہی تھک کر
بات خود سے بھی کب ہوئی تھک کر

پھر مرمت خدا ہی کرتا ہے
ٹوٹ جاتا ہے جب کوئی تھک کر

آنسوؤں کو بھی راستہ نہ ملا
آنکھ میں رہ گئی نمی تھک کر

زندگی میں بڑے مسائل ہیں
بیٹھ جاتا ہے آدمی تھک کر

کچھ مضامیں نئے نکلتے ہیں
جب بھی ہوتی ہے شاعری، تھک کر

عزم جب سے چٹان جیسا ہے
میں نے دیکھا نہیں کبھی تھک کر

گھپ اندھیرے پہ وار کرتے ہوئے
کس طرف جائے روشنی تھک کر

شام ہوتے ہی دل کے ساحل پر
بیٹھ جاتی ہے جل پری تھک کر

ہجر میں ٹوٹنا تو پڑتا ہے
کس طرف جائے دل جلی تھک کر

محمد نوید مرزا

غزل

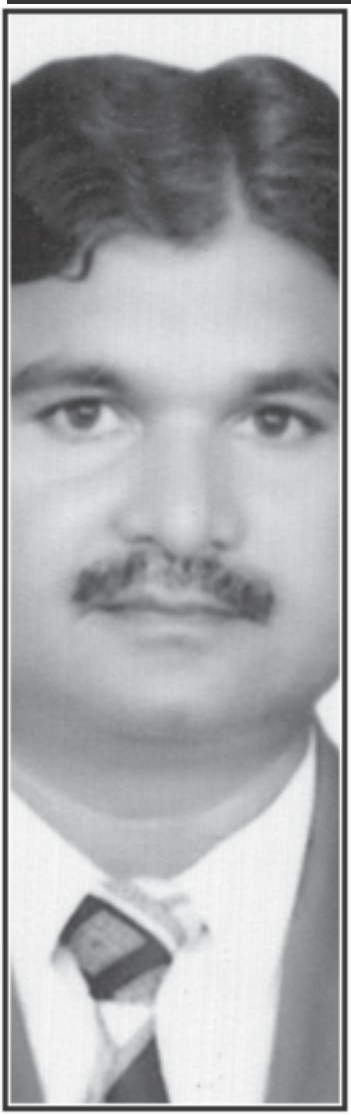

دہر کے اُجڑے دیاروں کی طرح
جی رہا ہوں بے سہاروں کی طرح

تُو یگانہ ہے بھرے بازار میں
اور میں لاکھوں ہزاروں کی طرح

دل زدوں کو پوچھتا کوئی نہیں
اِس نگر میں غم گساروں کی طرح

مر چلا ہوں میں خزاں کے خوف سے
لوگ زندہ ہیں بہاروں کی طرح

فلسفی ہے یہ ہمارے شہر کا
یہ جو بیٹھا ہے گنواروں کی طرح

بہہ گئے ہیں وقت کے سیلاب میں
یار تھے جو کوہساروں کی طرح

کوئی اُس کا وزن ہے نہ بار ہے
اُڑ رہا ہے وہ غباروں کی طرح

بُجھ گئی ہے اُس بدن کی روشنی
جو چمکتا تھا ستاروں کی طرح

انصر حسن

غزل

لہجوں کے میٹھے زہر نے اپنا اثر دِکھا دیا
اہلِ ہنر نے آخرش دستِ ہنر دِکھا دیا

ہم تو کبھی خیال میں لاویں نہ ایسی چال بھی
اپنی گِرا کے سوچ کو تم نے مگر دکھا دیا

اُس نے کہا تھا مان سے تازہ ہے کچھ تو پیش کر
میں نے بھی اُس کو کھول کر زخمِ جگر دِکھا دیا

رکھنا تھا اس کے سامنے رختِ وفا ثبوت میں
کچھ نہ بنا تو آنکھ میں لا کے گہر دکھا دیا

اُس کے لیے تو کھیل تھا ہم نے بھی کھیل کھیل میں
دل سے اُسے اُتار کر بارِ دگر دکھا دیا

ہم تو وفا کے موڑ پر اب بھی کھڑے ہیں دوستو
تم نے تو پل میں باندھ کر رختِ سفر دکھا دیا

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جسم کے پار کون دیکھے گا !
روح کا بار کون دیکھے گا !

غزل

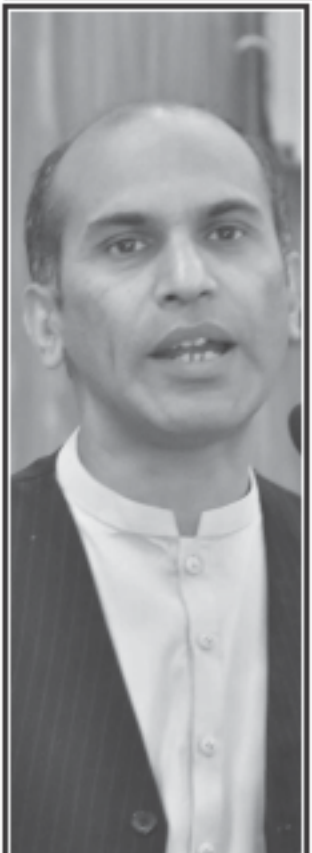

اِتنا ہے یقیں ہم ہیں بہت غیر یقینی
اُڑتے ہیں ہواؤں میں مگر ہیں تو زمینی

اُتری جو وبا اُس نے یہ آگاہ کیا ہے
ہم گوشت کے اِنساں ہیں کہ آلاتِ مشینی

ہم وصل کے لمحات کے خواہاں ہی نہیں ہیں
ٹھہری جو حرام اِس لیے پھر کاہے کو پینی

کام آئے کسی کے تو وہ تصویر بنالی
اِتنی تو بقایا ہے ابھی غیرت دینی

حیرت سے شفیق اپنے معالج کو تکے ہے
ہم دَر بدروں کے لیے کیا گوشہ نشینی

محمد شفیق انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل بھر آئے تو سمندر نہیں دیکھے جاتے
عکس، پانی میں اُتر کر نہیں دیکھے جاتے

غزل

میں لپٹ کے خود سے ہوں کہہ رہا میں اداس ہوں
کسی اور سے تو نہیں کہا میں اداس ہوں

وہ جو دھڑکنوں کے مزاج تک سے تھا آشنا
اسے کیوں نظر نہیں آ رہا میں اداس ہوں

میں اداس ہوں میں اداس ہوں میری بات سن
اسے صرف جا کے یہی بتا میں اداس ہوں

وہ جو ایک دم سے بچھڑ گیا تو میں شل ہوا
مجھے دوسروں سے پتا چلا میں اداس ہوں

میرے اپنے بخت کی بات ہے میں اجڑ گیا
وہ کسی کا کیوں نہیں ہو سکا میں اداس ہوں

مرے بارشوں سے مچلتے دل کا بھی مان رکھ
کبھی کام چھوڑ کے جلدی آ میں اداس ہوں

تجھے لگ رہا ہے کہیں سے بھی مجھے رنج ہے؟
تجھے کس طرح سے پتا چلا میں اداس ہوں

میں تڑپ رہا ہوں فراق میں تری یاد میں
مجھے اپنے سینے سے پھر لگا میں اداس ہوں

وہی رنگ ہو وہی ڈھنگ ہو مرے دیوتا
اسی نام سے مجھے پھر بلا میں اداس ہوں

تری بے رخی کا کمال ہے یہ ملال سب
کوئی وصل رت کا بھی گیت گا میں اداس ہوں

کوئی پوروانگ کا راگ ہو، کوئی ناگ ہو
مجھے شدھ بہار تو مت سنا میں اداس ہوں

خالد ندیم شانی

غزل

کب ہمیں ہجر کے آزار سے ڈر لگتا ہے
ڈر جو لگتا ہے تو غم خوار سے ڈر لگتا ہے

حُسن کے حاشیہ بردار سے ڈر لگتا ہے
آج کل عشق کے آزار سے ڈر لگتا ہے

کیسے آباد ہوا کرتا تھا برسوں پہلے
شہرِ مدفون کے آثار سے ڈر لگتا ہے

جانے کس موڑ ہلائی ہے طبیعت اپنی
دشت سے، رونقِ بازار سے ڈر لگتا ہے

لشکرِ غیر سے کچھ خوف نہیں ہے مجھ کو
اپنے اِک ایک طرف دار سے ڈر لگتا ہے

نیند آتی نہیں اِس واسطے شب بھر مجھ کو
خواب سے، خواہشِ بیدار سے ڈر لگتا ہے

مجھ کو اس بار نتیجے پہ پہنچنا ہے ضرور
اب کے بے کار سی گفتار سے ڈر لگتا ہے

آج کل پیار ہے بے کار سا سودا سائیں
اِس لیے پیار کے اظہار سے ڈر لگتا ہے

جس کی ہر شاخ رہے غنچہ و گل سے خالی
مجھ کو اس طور کے گلزار سے ڈر لگتا ہے

تن بدن میں نہ کہیں آگ لگا دے اب کے
مجھ کو اب سایۂ دیوار سے ڈر لگتا ہے

خوف آتا ہے مجھے اب کے گھنے پیڑوں سے
مجھ کو ہر شاخِ ثمردار سے ڈر لگتا ہے

خوف آتا ہے تو بگڑے ہوئے لہجوں سے نبیل
مجھ کو خنجر سے نہ تلوار سے ڈر لگتا ہے

نبیل احمد نبیل

غزل

شمار کرتے نہیں مجھ کو خاندان میں تم
مجھے یہ ڈال رہے ہو کس امتحان میں تم

یہ لگ رہا ہے نہیں مطمئن نشانے سے
رکھو گے تیر بھلا کب تلک کمان میں تم

یہ مانا حُسن میں رکھتے نہیں تم اپنا جواب
کہ کامیاب نہیں عشق کی اُڑان میں تم

محبتوں کے خزانے بکھیرتے ہی رہیں
زمیں کی گود میں ہم اور آسمان میں تم

تمہاری بندگی کرتا ہوں دیکھنا کیسے
حروف اپنے نہ ڈالو مری زبان میں تم

ہوا میں اُڑتے پرندوں کو دیکھتے کیوں ہو
اکیلے ہی پڑے رہتے ہو کیا مکان میں تم

مجھے یقیں ہے کہ جب چھوڑ جاؤ گے مجھ کو
اکیلے ہی کہیں رہ جاؤ گے جہان میں تم

علی حسین عابدی

غزل

لمحہ عذاب تھا کبھی، عرصہ گزر گیا
تیرے بغیر وقت گزارا ، گزر گیا

بچھڑا تو ایک دشت سی لگنے لگی حیات
آنسو بہے تو آنکھ سے دریا گزر گیا

تیرے بغیر سانس بھی لینا محال تھا
تیرے بغیر ایک زمانہ گزر گیا

کل شب کا سانحہ ہے مرے دوست با خدا
وہ شخص میرے سامنے آیا گزر گیا

بے چین پھر رہا تھا قمر کی تلاش میں
کل شب کسی نے اس کو بتایا، گزر گیا

قمر بشیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

تُو نے کس کس کرب میں اب تک مجھے ڈالا نہیں
زندگی! میں پھر بھی حدِ ضبط سے نکلا نہیں

اک عجب سی جنگ ہے دو طاقتوں کے درمیاں
عقل بھی جیتی نہیں اور عشق بھی ہارا نہیں

وقت سے پہلے ہی ہو جاتے بزرگوں میں شمار
درد کو بس درد سمجھا ، دردِ سر سمجھا نہیں

عالمِ دیوانگی کا مجھ پہ غلبہ ہے ضرور
خودکشی کرنے کو لیکن ہاتھ میں تیشہ نہیں

ساتھ رکھا ہے تجھے اپنا مُربّی جان کر
زندگی! کیوں تُو نے رستہ موت کا روکا نہیں

آسماں تک کیوں نہیں جاتی مری آہ و فغاں
کیا زمیں پر میں ترے ہی حکم سے اترا نہیں

غیر جا پہنچے ترقی کی حسیں منزل تلک
میں تنزل کے بیاباں سے ابھی نکلا نہیں

زیب دیتا ہے ترے ہونٹوں کو رنگِ اِفترا
میرے معیارِ وفا سے میل وہ کھاتا نہیں

آسماں کی وسعتوں کی بات لے بیٹھے ہو تم
میں ابھی موجِ نفس کی تہ تلک پہنچا نہیں

کھل نہ جائے اب تری بے اِعتنائی غیر پر
میں جُدا ہو کر بھی تجھ سے ٹوٹ کر رویا نہیں

ظلم ڈھاؤ جس قدر حاصل ہے تم کو اختیار
ظالمو! میداں سے فرحاں بھاگنے والا نہیں

سرور فرحان

غزل

کوئی سمجھا نہ سمجھنے کی ضرورت سمجھی
ویسے ہم تھے ہی نہیں جیسا یہ خلقت سمجھی

ہم نے بس ہونٹ سیے اور نہ دیکھا کچھ بھی
اور کمبخت یہ دنیا اسے عادت سمجھی

حسبِ توفیق سبھی نے ہمیں مارے پتھر
ہم نے اس ضمن میں خاموشی عبادت سمجھی

ہم مودت میں شہادت کا سفر کرتے رہے
جب کہ دنیا اسے بے کار مسافت سمجھی

خشک سالی میں بھی رہنا ہے سمندر جیسا
ہم نے یہ بات بھی دریا کی وساطت سمجھی

اب وہ تحریف کو تخلیق سمجھ بیٹھا ہے
جس نے کچھ سالہ نجالت بھی ریاضت سمجھی

اک بھروسہ تھا جو کچھ روز میں اٹھ جائے گا
اس نزاکت کو جواب بھی نہ عدالت سمجھی

شہر کا شور سماعت کو گراں لگنے لگا
پھر رعایا نے پرندوں کی حکومت سمجھی

وہ کبھی ظلم کی تائید نہیں کر سکتا
جس نے کربل کے مکینوں سے شہادت سمجھی

خیمۂ شب کی طنابوں سے یہ آواز اٹھی
تم نے تو خانہ بدوشی بھی سکونت سمجھی

خرقہ پوشوں کی ارادت میں تھا ادراک کھلا
اہلِ دانش میں جو بیٹھا تو جہالت سمجھی

دانش عزیز

غزل

حیرت زدہ جہان میں آنا پڑا مجھے
یعنی کھنڈر مکان میں آنا پڑا مجھے

کاغذ، قلم، کتاب اور چائے کے شوق میں
اک شعری خاندان میں آنا پڑا مجھے

بے بال و پر کی حالتِ ابتر کے باوجود
پھر سے نئی اڑان میں آنا پڑا مجھے

اک جبرِ ناروا کے تسلط کے عہد میں
لوگوں کے درمیان میں آنا پڑا مجھے

دوشیزگی میں حسن نکھرتا چلا گیا
پھر عشق کی اٹھان میں آنا پڑا مجھے

پُر امن زندگی کی تمنا لیے ہوئے
اس شہرِ بے امان میں آنا پڑا مجھے

اصغر میں سہہ سکا نہ ستم اہلِ دہر کے
بے مہر آسمان میں آنا پڑا مجھے

اصغر علی بلوچ

غزل

گویا اس آس پہ زندہ ہوں کہ مر جاؤں گا
اک نہ اک روز تو میں لوٹ کے گھر جاؤں گا

میں ابھی چاک پہ ہوں اور ترے ہاتھ میں ہوں
تو مرے نقش سنوارے تو سنور جاؤں گا

دیکھ، پر اتنی توجہ سے بھی مت دیکھ مجھے
عیب اتنے ہیں کہ میں دل سے اتر جاؤں گا

مجھ کو پلکوں پہ بٹھانا ہے تو یہ دھیان رہے
تیری نظروں سے گروں گا تو بکھر جاؤں گا

اک ترا دل ہی تو ہے جائے اماں میرے لیے
تو نے دل سے جو نکالا تو کدھر جاؤں گا

خود سے وعدہ یہ کیا ہے کہ نہ بولوں گا کبھی
تو منائے گا تو وعدے سے مکر جاؤں گا

کچھ سفر اپنے تصرف میں نہیں ہوتے ہیں
کیسے کہہ دوں کہ تو روکے تو ٹھہر جاؤں گا

یہ جو سطحی سی بصارت ہے مجھے کافی ہے
سارے پردے نہ ہٹا، دیکھ کے ڈر جاؤں گا

تجھ کو الفاظ کی تصویر کشی آتی ہے
ایسے منظر نہ دکھا درد سے بھر جاؤں گا

وہ گلی جس میں ترا کوئی نہیں اب رہتا
ایسا لگتا ہے کہ پھر آج اُدھر جاؤں گا

تُجھ کو رسوائی سے ڈرنے کی ضرورت ہی نہیں
تیرے کوچے سے میں چُپ چاپ گزر جاؤں گا

علمدار حسین

غزلیں

آنکھ سے عداوت کی
نیند نے بغاوت کی

دیکھ کر ہماری اور
آپ نے عنایت کی

اُس کتاب چہرے کی
رات بھر تلاوت کی

سامنے ہے تیرے وہ
بات ہے بصارت کی

بے حجاب ہونے پر
آپ نے قیامت کی

موم تھے مگر افضل
آگ سے محبت کی

آپ چپ رہے لیکن
آنکھ نے جسارت کی

افضل ہزاروی

ٹھنڈک ہے جو چھاؤں میں
خوبی ہے وہ ماؤں میں

کیسے رُکتا گاؤں میں
لکھا سفر تھا پاؤں میں

کس کے بدن کی خوشبو ہے
چنچل شوخ ہواؤں میں

دھوپ نے زندہ رکھا ورنہ
مر جاتا میں چھاؤں میں

یار منانا پڑتا ہے
گھنگھرو باندھ کے پاؤں میں

کون مجھے پہچانے گا
افضل اب کے گاؤں میں

غزل

سمے کے جال میں رہنا پڑے گا
کہ ماہ و سال میں رہنا پڑے گا

کبھی سوچا نہیں تھا زندگی میں
ہمیں اِس حال میں رہنا پڑے گا

یہ وحشت ، بےسکونی ، رائیگانی
اسی پاتال میں رہنا پڑے گا

کہانی بن رہی ہے دھیرے دھیرے
ابھی چوپال میں رہنا پڑے گا

نہیں اپنے موافق گو یہ دنیا
اسی جنجال میں رہنا پڑے گا

یہ شطرنجی محبت ..... صبر ، شاہد
پیادی چال میں رہنا پڑے گا

شاہد فرید

غزل

دریا کنارے بیٹھا بھی پیاسا لگا مجھے
میلے میں آ کے بھی کوئی تنہا لگا مجھے

مسکان منافقت کی مرا دل جلا گئی
دشمن کا منہ پہ بولنا اچھا لگا مجھے

ہر سانس جیسے وجہِ شکستِ وجود ہے
ہر لمحہ ایک گھن کی طرح سا لگا مجھے

جیسے ٹریڈمل پہ ہوں اور چل نہیں رہا
ایسا بھی ہو رہا ہے کچھ، ایسا لگا مجھے

آتا گیا قریب تو کھلتا چلا گیا
اک شخص جو کہ دُور سے اچھا لگا مجھے

دیکھا اُسے جو پیار کا چشمہ اتار کر
اِتنا بڑا نہیں تھا وہ جتنا لگا مجھے

بے وجہ کا مبالغہ اچھا نہیں میاں
جو جس قدر بلند تھا، اُتنا لگا مجھے

وہ جسم سے قریب تھا پر روح سے نہیں
دلشاد ساری عمر جو اپنا لگا مجھے

دلشاد احمد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چھوڑتے ہی نہیں زندانِ تعلق خالد
کچھ اسیروں کو اگر چھوڑ دیا جاتا ہے

غزل

ہر کسی کا نرالا جوہر ہے
کوئی ہیرا ہے کوئی کنکر ہے

تیز آندھی میں رکھ دیے جائیں
یہ چراغوں کے حق میں بہتر ہے

اس لئے ہوں غزل کا دیوانہ
کیونکہ شعر و سخن کا جھومر ہے

دشت دریا سے ملنے آیا ہے
دیکھ کیسا عجیب منظر ہے

اک نگاہِ کرم ہو اس جانب
دل کی دھڑکن ازل سے بنجر ہے

سیر کیسے جمالِ یار سے ہو
یہ جو صدیوں کا پیاسا لشکر ہے

ان گنت بھید دفن ہیں اس میں
یہ مرا دل ہے یا سمندر ہے

مستحسن جامی

غزل

پہروں گھر میں تنہا بیٹھا رہتا ہوں
دیواروں سے باتیں کرتا رہتا ہوں

برسوں پہلے تو نے خط جو لکھے تھے
ان کو پڑھ کے آہیں بھرتا رہتا ہوں

کتنے اچھے دن تھے وہ جو بیت گئے
یادوں سے میں دل بہلاتا رہتا ہوں

ہر آہٹ پر چونک اُٹھتا ہے دل میرا
چاپ ترے قدموں کی سنتا رہتا ہوں

تاریکی سے دل اتنا مانوس ہوا
روشنیوں سے اب میں ڈرتا رہتا ہوں

ہجر کا سورج جانے کس دن ڈوبے گا
سوچوں کی میں چادر بنتا رہتا ہوں

میں تو کب کا خود کو بھول چکا اشفاق
تیرے نام کی مالا جپتا رہتا ہوں

محمد اشفاق بیگ

غزل

تم جسے چاہو عدوئے یار کہہ کر مار دو
جس کو چاہو راہ کی دیوار کہہ کر مار دو

ہم کہاں کے آدمی ہیں، ہم تو بس حشرات ہیں
روند ڈالو کہہ کے عقرب، مار کہہ کر مار دو

جو اذیت دے رہے ہو اس سے بہتر ہے کہ تم
مجھ کو باغی قوم کا سردار کہہ کر مار دو

تم مرے دشمن کے لشکر سے تو لڑ پائے نہیں
مجھ کو دشمن کا سہولت کار کہہ کر مار دو

تم یہاں مختار کل ہو کون پوچھے گا تمہیں
کچھ نہ بن پائے تو پھر غدار کہہ کر مار دو

ہم نے خود بندوق دی تم کو حفاظت کے لیے
اب بھلے ہم کو ہی بدکردار کہہ کر مار دو

جس کو چاہو تخت کا حق دار ٹھہراؤ جناب
تخت چھینو، دار کا حق دار کہہ کر مار دو

انتقام اس طور لینے کا یہاں دستور ہے
کوئی تہمت جڑ کے بدکردار کہہ کر مار دو

جانتا ہوں ہر ستم کا ڈھونڈ لیتے ہو جواز
یوں کرو اب دشمنِ عیار کہہ کر مار دو

ہم نہتوں سے تو چھٹکارہ کوئی مشکل نہیں
جب بھی چاہو جان کا آزار کہہ کر مار دو

پیشتر اس سے کہ مانگے جب کوئی تم سے حساب
تم سگِ دیوانہ و بیمار کہہ کر مار دو

رانا سعید دوشی

غزل

اورنگزیب حسام حر

ہر ایک بات مرے دل کی مانتا ہوں میں
سمجھ نہ آئے تو سکہ اچھالتا ہوں میں

یہ ماجرا ہے عجب یاد بھی نہیں آتی
یہ اور بات سدا اس کو سوچتا ہوں میں

ہر ایک بات پہ قسمیں وہ کھانے لگتا ہے
ہر ایک بات مگر اس کی جانتا ہوں میں

ورق تمام کتابوں کے وہ الٹتا ہے
اور ایک سمت کھڑا دل سنبھالتا ہوں میں

وہ چیخ چیخ کے دنیا سے جھوٹ کہتا ہے
خموش رہ کے گریباں میں جھانکتا ہوں میں

وہ ایک سانس میں قصے کئی سناتا ہے
اور ایک لفظ میں اقرار چاہتا ہوں میں

اُسے ہے علم بغیر اُس کے رہ نہیں سکتا
وہ جانتا ہے اُسے اب بھی ڈھونڈتا ہوں میں

غزل

خواب کو آئنہ سمجھتے رہے
کیا سمجھنا تھا کیا سمجھتے رہے

حسن سے عشق کرنے والے لوگ
حسن کا مسئلہ سمجھتے رہے

وہ حقیقت پسند آدمی تھا
سب جسے خواب سا سمجھتے رہے

ہجر تو داستاں مکمل تھی
اور ہم واقعہ سمجھتے رہے

سخت غافل تھے تیرے دیوانے
نیند کو رابطہ سمجھتے رہے

سادگی تھی کہ تیرے جانے کو
آخری سانحہ سمجھتے رہے

لب کشائی کے منتظر تھے ہم
سو ترا مدعا سمجھتے رہے

خودپرستی میں مبتلا احباب
ہم کو بھی پارسا سمجھتے رہے

زندگی کو گذارنے والے
شاعری کو دعا سمجھتے رہے

ایک دن پڑ گیا گلے عاصم
ہم جسے مشغلہ سمجھتے رہے

عاصم اعجاز

غزل

کہی کے بعد کسی اَن کہی کی آہٹ ہے
کہ میرے ساتھ ابھی زندگی کی آہٹ ہے

ہوائے شام ! تُو ہی آرزو بنا مجھ کو
کہ گہری رات ہے، آزردگی کی آہٹ ہے

یہ کیسا شور ہے ، میرے نِگار خانے میں
صدا خموش ہے اور خامشی کی آہٹ ہے

تری طلب ہے مرے دل کی دھڑکنوں کا سبب
دھڑک رہی ہے جو وابستگی کی آہٹ ہے

ابھی نہیں مجھے واعظ نصیحتیں درکار
ابھی تو ساتھ مِرے سرکشی کی آہٹ ہے

فضا میں میری سزاؤں کی چاپ ہے عظمیٰ
یہ آپ سے مِری وارفتگی کی آہٹ ہے

عظمیٰ نقوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جذبوں کے بادل لائیں گی یا رُوح بیچ، کر جائیں گی
کیا جانے کس سمت سے کیسی ہوائیں آئیں گی

غزل

یاد ہی نہیں رہتا اب تو دن کے کاموں میں
کون کون ملتا تھا فرصتوں کی شاموں میں

خواب کی وریدوں میں درد بہتا رہتا ہے
خوف دوڑے پھرتا ہے، جسم کے مساموں میں

سبز پیلے پڑتے ہیں، ہونٹ نیلے پڑتے ہیں
زہر کا تصرف ہے، آگہی کے جاموں میں

مستقل کوئی منظر، آنکھ میں نہیں رُکتا
وقت نے لگائی ہے دوڑ تیز گاموں میں

سب کی ایک قیمت ہے، سب کا مول پڑتا ہے
دیکھتا ہے بکتا ہے کون کتنے داموں میں

کون سوچ سکتا ہے حسن سے بغاوت کا
سرکشی نہیں ہوتی عشق کے غلاموں میں

آیتِ محبت کا ورد کرنا بنتا ہے
ہجر کے درودوں میں، وصل کے سلاموں میں

اُس بچھڑنے والے کو اب بھی ڈھونڈتا ہے دل
ملتے جلتے چہروں میں، ایک جیسے ناموں میں

لقمہء فراواں کی کھا گئی ہوس ہم کو
ورنہ ہوتے ہم آزر..... وقت کے اماموں میں

جنید آذر

غزل

اتری ہے کوئی روشنی دل کی زمین پر
ظلمت نہیں ہے مرشدی دل کی زمین پر

آزاد دوست ہیں مرے اب دشمنوں کے ساتھ
مہنگی پڑے گی دشمنی دل کی زمین پر

اخلاص اور وفا میں دل و جاں لٹائیں گے
ہے معتبر یہ دوستی دل کی زمین پر

اس بار دردِ دل بھی عجب طور سے اٹھا
میں زخم زخم سے سجی دل کی زمین پر

خوشبو مہک رہی ہے مرے انگ انگ میں
تازہ گلاب ہے کوئی دل کی زمین پر

میرے حبیب مرے سوا سوچنا نہیں
آئے نہ کوئی دوسری دل کی زمین پر

لیکن سنی گئی نہ محبت کی راگنی
بجتی رہی ہے بانسری دل کی زمین پر

میرا سجن اڑے ہے فلک پر ادھر ادھر
کیسے کٹے گی زندگی دل کی زمین پر

اپنے سوا کسی کی صدائیں نہ سن سکی
طاری رہی ہے خامشی دل کی زمین پر

آنکھوں میں خواب پلتے رہے ہیں مگر جیا
تعبیر مل نہیں سکی دل کی زمین پر

جیا قریشی

غزل

آپ جس دن سے ہوئے آنکھ کے روزن سے پرے
شادمانی کے سبھی رنگ ہیں جیون سے پرے

پھر خیال آیا ترے حسن کی رعنائی کا
پھر تصور گیا الہام کی چلمن سے پرے

اب تو ہم درد اسیروں کا ٹھکانہ ہے وہی
وہ جو کٹیا نہیں وہ یاس کے آنگن سے پرے

نفسا نفسی کی گھٹن کیوں نہ بڑھے بستی میں
لوگ جب ہو گئے احساس کے درپن سے پرے

کوئی آسیب اتر آیا ہے کیا جیون میں
کیوں اترتی ہیں بہاریں مرے گلشن سے پرے

آج وہ بھی ہیں جدا شومیٔ قسمت مجھ سے
ایک پل کو نہ ہوئے دور جو دھڑکن سے پرے

کوچۂ عشق بھی اب کوچۂ تہمت ہے نرا
جو ہیں عاجز رہیں الزام کی الجھن سے پرے

نوید عاجز

غزلیں

میں نے جب سوچا اسے نزدیک جا کر اور بھی
ہو گیا وہ دسترس سے میری باہر اور بھی

اُس کی تصویر آنکھ کے ساحل پہ آویزاں نہ کر
چاند دیکھے گا تو بپھرے گا سمندر اور بھی

بھیگتے رخسار بھی اور شبنمی قطرے بھی تھے
اور نکھرتا جا رہا تھا وہ گلِ تر اور بھی

اب مرے دن رات وابستہ ہیں تیری یاد سے
اب زمیں کو ہو میسر ایک محور اور بھی

دل کی باتیں دل میں رکھنے پر ندامت تھی مجھے
میں پشیماں ہو گیا اُس کو بتا کر اور بھی

آنسوؤں میں بھیگ کر جو آئینہ دھندلا گیا
زخم فرقت میں ہوئے دل کے اجاگر اور بھی

کیا ہُوا جبران اُن ہاتھوں کو آخر کیا ہُوا
جن کی دستک سے مہکتا تھا مرا در اور بھی

وسیم جبران

اُسی کا عکس ہے جو اُس کے شاہکار میں ہے
جہاں کا حسن سبھی حسنِ کردگار میں ہے

رکا جو میں تو ستارہ سفر کا ڈوب گیا
میں چل پڑا ہوں تو منزل بھی انتظار میں ہے

کسی کو میں جو بتاتا تو پھر بتاتا کیا
وہ ایک شخص ہے جو دل کے تار تار میں ہے

یہ میرا دل جو بغاوت پہ تُل گیا ہے آج
نہ جانے کون ہے یہ جس کے انتظار میں ہے

بھٹک رہا ہے وہ اب تک گماں کی گلیوں میں
وہ ایک اجنبی جو دل کے اس دیار میں ہے

غزل

شعر میں یار کا جب ہم نے سراپا باندھا
پھر جو لوگوں نے فسانے پہ فسانہ باندھا

کبھی پتھر کبھی شیشہ کبھی ہیرا باندھا
ایک پیکر کو ہی اشعار میں کیا کیا باندھا

ہم کسی سے کبھی ہارے ہی نہیں تھے لیکن
اُس نے دل پر جو نگاہوں سے نشانہ باندھا

دل نے جو حال کیا تھا وہ ہمیں جانتے ہیں
جب ترے شہر سے جانے کا ارادہ باندھا

ختم ہونے کو نہ آئی جو مسافت اپنی
آخرش ہار کے پاؤں سے تھکانہ باندھا

کیا سخاوت ہے صغیر اُس نے ہمارے دل کا
اک نظر پورے مہینے کا وظیفہ باندھا

صغیر احمد صغیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہاتھ میں اپنا ہاتھ ہے اور ہوا کا ساتھ ہے
پیشِ نگاہِ گمرہی ، وجہِ سفر نہیں تو کیا

غزلیں

لگتا ہے کسی خواب میں اب آنکھ کھلی ہے
یا ٹوٹا کوئی خواب ہے جب آنکھ کھلی ہے

اِک خواب تھا جو کچھ بھی کتابوں میں پڑھا تھا
دُنیا نے جگایا ہے تو تب آنکھ کھلی ہے

غیروں کے بھروسے پہ ذرا آنکھ لگی تھی
اپنوں کی عنایت کے سبب آنکھ کھلی ہے

جب خُود پہ گُذرتی ہے تو ہوش آتا ہے بھائی!
اوروں کے تجربات سے کب آنکھ کھلی ہے

خوابوں نے کسی طور بھی سونے نہ دیا تب
اِک خواب میں سوتے ہوئے شب آنکھ کھلی ہے

اِک کرب کے ہاتھوں میں جو بے سُدھ سے پڑے تھے
جب باعثِ یک شورِ طرب آنکھ کھلی ہے

راجہ عبدالقیوم

دل میں گر تھی کبھی کوئی، اُمید
وہ بھی اب تو نہیں رہی، اُمید

سارے قوسِ قزح کے رنگوں سی
قرمزی ، سبز ، سرمئی ، اُمید

کتنی مایوسیوں میں پالا اِسے!
پھر بھی آخر میں مر گئی، اُمید

اُس نے دیکھا کچھ ایسی نظروں سے
مِٹ گئی سب رہی سہی ، اُمید

اِس سے مایوسیاں بہت بہتر!
ہو ادھوری جو سرسری، اُمید

یاالٰہی ، ہو خاتمہ بالخیر
اب یہی ہے بس آخری، اُمید

غزل

پیار لایا بے رُخی کا امتحاں چلتا رہے
سلسلہ کچھ تو ہمارے درمیاں چلتا رہے

لمحے لمحے سے کشیدیں ہم نشاطِ زندگی
لمحے لمحے پر دُعا کا سائباں چلتا رہے

ختم کیسے ہو سکے گا درمیانی فاصلہ
میں یہاں چلتا رہا اور تو وہاں چلتا رہے

رات بھر تکتے رہیں ہم چاند تاروں کا سفر
رات بھر آنکھوں میں عکسِ مہرباں چلتا رہے

ہم شکستِ فاش دیں گے دیکھ لینا دوستو
چال جو چلنی ہے نیلا آسماں چلتا رہے

جام بھر بھر کے یونہی دیتا رہے ساقی ہمیں
میکدے میں زاہدوں کا بھی بیاں چلتا رہے

ہم کو شاہد بھاگنی ہے قید خانے کی فضا
اب تو بہتر ہے سفر سارا یہاں چلتا رہے

ہمایوں پرویز شاہد

غزل

اِس زندگی کے تپتے ہوئے ریگ زار میں
غم کاشت کر رہا ہوں میں فصلِ بہار میں

حاصل نہیں ہے اب مجھے دریا پہ دسترس
لے دے کے "العطش" ہے مرے اختیار میں

منظر میں کچھ ہی دیر رہے گا مرا وجود
پھر اُس کے بعد ہے مجھے ملنا غبار میں

دُکھ ہجر کا ہے ایسا کہ مرنے کے بعد بھی
سونے نہ دے گا چین سے کُنجِ مزار میں

رسوائی کی بھی اپنی ہی لذت ہے دوستو
رکھتی ہے مدتوں ہمیں اپنے خمار میں

ممکن ہے میرا نام کتابوں میں لکھا جائے
ممکن ہے آ سکوں نہ کسی بھی شمار میں

مجھ ہر کُھلے یوں عالمِ اِمکان کے ورق
اب دو جہاں ہیں میری نظر کے حصار میں

اشرف مجھے جو شعر پہ مجبور کرتی ہے
اِک دُھن چھپی ہوئی ہے مرے دل کے تار میں

اشرف نقوی

غزل

ڈوب چکے ہیں صحرا جنگل بارش میں
ایک ہُوا ہے آج تو جل تھل بارش میں

آج سنہرا سورج کتنا بے بس ہے
چھائے ہر سُو کالے بادل بارش میں

کُھل کر رو لے جس کو تو نے رونا ہے
بہہ جانے دے آج یہ کاجل بارش میں

رنگ دھنک کے امبر پر تو چھائے ہیں
اور زمیں پر رنگیں آنچل بارش میں

جھانک کے اُس مہ رُخ نے ایک دریچے سے
پیدا کر دی دل میں ہلچل بارش میں

دیکھیں کِس کِس دل پر بجلی گرتی ہے
نِکلی ہے اِک شوخ و چنچل بارش میں

تن من میں بارش نے آگ لگا دی ہے
آؤ کر دیں اِس کو شیتل بارش میں

تُم کیا جانو، پوچھو ہجر کے ماروں سے
کیسے گزرا رات کا ہر پل بارش میں

دھیرے دھیرے چلنا ہوگا، پھسلن ہے
ٹوٹ نہ جائے گِر کر چھاگل بارش میں

جس رستے پر اُس کا گھر بھی پڑتا ہے
آج ہوا ہے سارا دلدل بارش میں

آج ضیا نے ملنے اُس کو بَن ٹھن کر
جانا ہے اور وہ بھی پیدل بارش میں

سید ضیا حسین

غزل

زخم ہوگا اتنا گہرا، ہم نے سوچا تک نہ تھا
درد ہوگا جان لیوا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

گاؤں کا تو ذکر ہی کیا، شہر دریا بن گئے
رات دن یوں ابر برسا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

یوں اُجڑ جائیں گی پل میں ہنستی بستی بستیاں
یوں بپھر جائے گا دریا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

یوں اڑے گی خاک ہر سُو کوچۂ و بازار میں
شہر بن جائیں گے صحرا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

مفلسی بے چارگی دیتی پھرے گی دستکیں
لب پہ ہوگا آٹا آٹا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

آپ نے تو مرتے مرتے ہم کو زندہ کر دیا
آ ملے گا آپ ایسا، ہم نے سوچا تک نہ تھا

شیخ اقبال

غزل

غضنفر مہدی

زہر اگرچہ بول رہا ہے
لیکن امرت گھول رہا ہے

ہجر زبوں میں وصل کا پنچھی
کس لیے اب پَر تول رہا ہے

دامِ وفا وہ کیا جانے گا
عشق جو زر میں تول رہا ہے

دشتِ جنوں میں اک شہزادہ
تختِ شاہی رول رہا ہے

ایک معمہ حل ہو کر بھی
ایک معمہ کھول رہا ہے

کون ہے جو اب بھوک کے مارے
خاک پہ ہیرے رول رہا ہے

شہر میں اب دستار کا مہدیؔ
ایک نوالہ مول رہا ہے

غزل (رباعی کے وزن میں)

دشتِ ہجر و وصال سے آگے ہے
رُکنا مرا ماہ و سال سے آگے ہے

قیدِ نظارہ ، آنکھ اور یہ مشکل
رازِ الفت جمال سے آگے ہے

وہ بھی گم ہے جو میرا ماضی تھا کبھی
مٹ جائے گا جو حال سے آگے ہے

اک یہ دنیا جو خواب کی حد تک ہے
اک خواہش جو خیال سے آگے ہے

حرفِ حق اور جبر کے موسم میں
لکھتے رہنا کمال سے آگے ہے

مائل بہ فنا ہے رقصِ ماہ و انجم
رازِ ہستی دھمال سے آگے ہے

تیری گفتار میں بھی جادو ہے مگر
تیری چپ سُر سے، تال سے آگے ہے

اک بستی سبز بیلوں اور پھولوں کی
جو رنج و غم و ملال سے آگے ہے

انجام ہے گل کا خاک ہوجانا حبیب
اور خوشبو ماہ و سال سے آگے ہے

بشیر احمد حبیب

غزل

حسن اک بار اگر پیشِ نظر ہو جائے
پھیل کر صحرا مرا دیدۂ تر ہو جائے

زلف بکھرے جو تری رات کی رانی مہکے
تو اگر کھول دے آنکھیں تو سحر ہو جائے

مسکراتے ہوئے آجاؤ کہیں سے یک دم
کاش تم کو مری حالت کی خبر ہو جائے

تم کبھی غور سے اک بار جو سن لو مجھ کو
میرا ہر لفظ، مری بات امر ہوجائے

شہرِ بینائی پہ گزرے گی قیامت کیسی
آنکھ سے آنکھ کوئی دور اگر ہو جائے

آسمانوں پہ اڑوں میں بھی خوشی کے مارے
زندگی جو ترے قدموں میں بسر ہوجائے

ٹوٹ جاتی ہیں ارادوں سے چٹانیں بھی کمال
شوق گر چاہے تو پتھر میں بھی در ہو جائے

محمد اشرف کمال

غزل

آنکھ دریا اتر گیا ہو گا
آ کے طوفاں گزر گیا ہو گا

تو نے تالی بجائی خوش ہو کے
وہ پرندہ تھا ڈر گیا ہو گا

اس کے سینے میں تو دھڑکتا تھا
اب ترے بعد مر گیا ہو گا

حسب عادت کیا تھا وعدہ بھی
حسب عادت مکر گیا ہو گا

جانتا ہوں میں اسکی فطرت کو
تم پہ الزام دھر گیا ہو گا

تو نے تو سوچا ہو گا بانہوں کا
اور آنکھیں وہ بھر گیا ہو گا

بعد مرنے کے باپ کے بیٹا
خود بخود ہی سدھر گیا ہو گا

لاش اپنی اسے ملی ہو گی
جب تھکا ہارا گھر گیا ہو گا

میں جسے دیکھتے چلا آیا
وہ مجھے دیکھ کر کیا ہو گا

نیند کی بے رخی سے تنگ آ کر
خواب آنکھوں میں مر گیا ہو گا

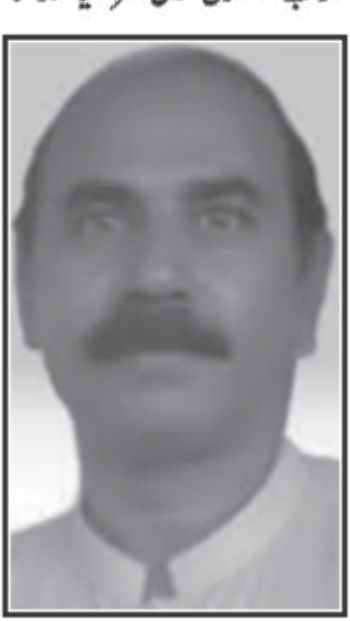

انصر رشید انصر

غزل

محبت میں جو گہرائی نہیں تھی
تبھی تو دشت پیمائی نہیں تھی

تری تصویر بھی گم سم تھی یکسر
مجھے بھی تاب گویائی نہیں تھی

محبت کا وہ لمحہ ابتدائی
کہ جب غم سے شناسائی نہیں تھی

مجھے وہ حسن مائل کر نہ پایا
نظر میں اب وہ رعنائی نہیں تھی

مرے شعروں میں جذبہ تھا یقیں کا
یونہی تو ان میں گہرائی نہیں تھی

کٹی کار زیاں میں عمر ساری
یہ ہر گز زین دانائی نہیں تھی

عبدالرؤف زین

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تبھی تاثیر تھا ہر شعر خالد
کسی جنگل میں یہ آہو نہیں تھا

غزل

محبت میں لذت ہے غم بھی ملے گا
کہیں قند ہو گی تو سم بھی ملے گا

بہت خوب ہے دوست رکھنا جہاں میں
مگر دوستی میں ستم بھی ملے گا

نہیں زندگی مختصر یہ ہماری
ابد کا نیا اک جنم بھی ملے گا

ابھی چاندنی ہے محبت ہے تم ہو
اماوس میں رنج و الم بھی ملے گا

غزل مری اک دن امر ہو گی محسن
کسی سرخ لب کا جو نم بھی ملے گا

کسی حال میں خوش نہیں انساں محسن
خوشی جو ملے گی تو غم بھی ملے گا

میتھیو محسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

حُسن محبت، حُسنِ ساعت ہے اپنے یاروں کا
دفترِ بے معنی ہیں ورنہ خالد کی تحریریں

غزل

نعیم رضا بھٹی

آج کل یوں مہک رہا ہوں میں
سب دلوں میں دھڑک رہا ہوں میں

وہ دیے عمر بھر رہیں روشن
جن کی لو سے تپک رہا ہوں میں

ایک دنیا اگر میسر ہے
کس کی جانب لپک رہا ہوں میں

ساتھ تم تھے تو چہچہاتا تھا
بن تمہارے سسک رہا ہوں میں

تم تھے موجود تو توانا تھا
حال اب یہ ہے تھک رہا ہوں میں

انتخاب

- خالد احمد -

غموں کا زہر کب سے پی رہے ہیں
نہ جانے کس طرح ہم جی رہے ہیں

نعمان منظور

غزل

میں نے یہ عشق کیا اس لیے تاخیر کے ساتھ
حضرتِ عشق نے کیا کیا نہ کیا میر کے ساتھ

دوستو پھول کا مطلب تو سمجھتے ہیں آپ
اس نے بھیجا ہے مجھے پھول بھی تصویر کے ساتھ

انگلیاں اٹھیں مرے ذہنی توازن پہ کئی
جب مری بات ہوئی تھی تری تصویر کے ساتھ

ایک ہی عشق کیا اور کیا ایسا عشق
جیسا غالب نے کیا میر تقی میر کے ساتھ

عشق نے جاتے ہوئے مجھ پہ یہ احسان کیا
شعر پڑھتا ہوں ہر اک بزم میں تاثیر کے ساتھ

جا بجا جسم پہ اتنے جو نشاں ہیں میرے
میرا بچپن سے تعلق رہا زنجیر کے ساتھ

اس لیے آنکھ کی لالی نہیں جاتی میری
خواب دیکھا ہے میری آنکھ نے تعبیر کے ساتھ

ہم نے ہر کام ہی تقدیر کو سونپا دانش
ورنہ کرتے ہیں سبھی عشق بھی تدبیر کے ساتھ

اعجاز دانش

غزل

کیسے نہ کہا جائے اسے کام کا منظر
آنکھوں کی ضرورت ہے در و بام کا منظر

دل ہے ہی اندھیروں کا طلبگار سو اس میں
اترے گا بہر طور کسی شام کا منظر

جس جس میں نہ آئیں گے نظر مجھ کو مرے لوگ
میں نام اُسے دوں گا فقط نام کا منظر

تب جا کے ہی ہوتی ہے ان آنکھوں کی تسلی
جب اِن کو دکھاتا ہوں میں ہر گام کا منظر

سو بار جھپک لی ہیں اُسے دیکھتے آنکھیں
میں اب بھی سحر کہہ دوں اُسے کام کا منظر

اسد رضا سحر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا دن تھے کہ گلیاں سمٹ آئی تھیں گھروں میں
یہ دھوپ سرِ کوچہ و بازار کہاں تھی

غزل

کسی نے اس لیے رکھا نہیں ہمارا غم
کہیں جگہ ہی نہیں دے رہا تمھارا غم

تو کیا پڑی ہے مسرت کے پاؤں پڑنے کی
خوشی سے دے رہا ہے جب ہمیں سہارا غم

تمام عمر اسی کشمکش میں الجھے رہے
کبھی ہیں بال سنوارے، کبھی سنوارا غم

اٹھائے پھرتی رہی ہم کو ایک موجِ رواں
تھی اک کنارا خوشی اور اک کنارا غم

کسی کے پاؤں کی زنجیر بن گئیں خوشیاں
کسی فقیر کو دیتا رہا سہارا غم

دعا کے بعد خدا نے کرم کیا دل پر
کبھی تو شعر اتارے کبھی اتارا غم

کسی کے آنے سے سینے سے آ لگی خوشیاں
کسی کے جانے سے کرنے لگا کنارا غم

خوشی کو ڈوبتے دیکھا تو رہ نہ پائے اسیر
چھلانگ مار کے دریا میں جا اتارا غم

اسیر حیدر

غزل

دل کی ہر بات دل میں رکھی ہے
چار جانب کسی کی چاپ سی ہے

میری دھڑکن کا اعتبار نہ کر
میرے دل میں تری خموشی ہے

ماں کے دم سے ہے زندگی میری
جس نے ہر حال میں دعا دی ہے

آج تنہائیوں کی یورش میں
تیرے ہونے سے روشنی سی ہے

میں کہاں اور ترا وقار کہاں
قیدِ معیار ہی اٹھا دی ہے

دیکھ کیا حال ہو گیا ہے حنا
آج ہر سو فقط اداسی ہے

حنا بابر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شکل شکل زندانی، سحرِ بے رُخی کی ہے
آرزوؤں کی بستی میں، دھوم سامری کی ہے

غزل

جاڑا تو وہ نہیں ہے مگر دُھند ہے بہت
پھر جانا بھی ہے تم کو، جدھر دُھند ہے بہت

اس دل میں کون آیا گیا کیا خبر، مجھے
آتا نہیں ہے کچھ بھی نظر، دُھند ہے بہت

کچھ دن تو میرے پاس رہو، میرے آس پاس
آتے ہی چل پڑے ہو کدھر، دُھند ہے بہت

آ جاؤ کہ ہم ان کا سہارا بنے رہیں
ہوں گے بہت اداس شجر، دُھند ہے بہت

جیسے ملیں، جہاں بھی ملیں کوئی ڈر نہ ہو
اچھا ہے یہ تو اور، اگر دُھند ہے بہت

دھندے تمام جاری و ساری ہیں ہر طرف
اب ہے کسی کا خوف نہ ڈر، دُھند ہے بہت

اب بھی تمہارے چاہنے والے نہیں ہیں کم
لیکن ابھی جناب ظفر، دُھند ہے بہت

امتیاز انجم

غزل

تیرے جور ہم ہی کو کیا دنیا بھر کو بھی یاد رہے
لیکن تیرا پردہ رکھا محفل میں ہم شاد رہے

تُو نے تو اپنے مدّاح کی قدر نہیں جانی، جاناں!
زخم ہمارے داد طلب تھے تجھ سے، پر بے داد رہے

ہاتھوں میں زنجیرِ الفت اور پیروں میں چھالے ہیں
ہم الفت کے قیدی لیکن کہنے کو آزاد رہے

قرب میں تیرے گلشنِ دل میں فصل بہاراں رہتی تھی
جب تک تو نزدیک رہا ہم بھی پل پل دلشاد رہے

رزم گہہ عشاق میں فاتح اہل زر ٹھہرے نعمان
باقی ماندہ صف میں لیکن کب مجنوں، فرہاد رہے

نعمان محمود

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دُھوپ کی، ریت کی، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اِک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

غزل

کعبۂ عشق ہوا ساتواں چکر پورا
ہم لُٹا بیٹھے ترے عشق میں گھر در پورا

دیکھ ہر سمت تری شکل نظر آتی ہے
ہم نے کاٹا ہے ترے نام کا چکر پورا

کاش اعصاب شکستہ ہوں کمر جھک جائے
کیسے پھرتا رہوں اس شہر میں در در پورا

روشنی تیری مددگار ہو اے ناظمِ شہر
ٹوٹے ہاتھوں سے بنایا ہے یہ اختر پورا

میں نے آواز اٹھائی تھی بھری بستی میں
سب کا حق مار کے جب اس نے کیا گھر پورا

دیکھ اس میں ہے کہیں نقرئی دھاگے کا رفو
سامنے تیرے پڑا ہے یہ مرا سر پورا

لوگ چلو میں لیے بھرتے ہیں تلچھٹ جس کی
ہم نے مٹھی میں رکھا حرف سمندر پورا

شاعری کام نہیں ورد ہے خودداری کا
وہ ادھورا ہی رہا جس نے کہا کر پورا

چھوڑ دے میری نگہبانی مجھے تنہا کر
چاہتا ہوں کہ لکھوں اپنا مقدر پورا

ہاتھ پاؤں کے سبب دنیا ملے گی اعجاز
عزت اس کو ہی ملے گی جو رہا نر پورا

اعجاز رضوی

ہمارا حاجی اورنگزیب (اسد خان) [خاکہ]

ہر دل عزیز اور میرے پیارے دوست اسد میں نہ تو کوئی حاجیوں والی خوبیاں ہیں اور نہ ہی بادشاہ اورنگزیب کی طرح قابلیت، دانائی اور کچھ کر دکھانے کی صلاحیت۔ لیکن مشتاق احمد یوسفی کے ایک کردار حاجی اورنگزیب کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اسد صاحب بڑے زود فہم انسان ہیں البتہ یہ بات کسی حد تک سچ بھی ہے کہ ان کی مٹھی بند رہتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی اپنے جاننے والوں کو بہت جلد مٹھی میں کر لیتے ہیں۔ میری پہلی ملاقات ان سے قائداعظم کالج میں ہوئی اور اُسی دن سے ان کا گرویدا ہُوا ہوں لیکن چند سال بعد مجھے احساس ہُوا کہ محبت اندھی نہیں ہوتی بلکہ واقعی محبت اندھی ہوتی ہے۔

اچھی صحت کے مالک ہیں۔ ہمیشہ ہشاش بشاش اور ہنس مکھ چہرہ لیے پھیرتے ہیں۔ اس قدر وزن دار کہ سوچتا ہوں اگر انسانوں کی قربانی ہوتی تو ان کا کیا ہوتا۔ پہلی فرصت میں ان کو دیکھ کر قصائی، نانبائی، سپیرے اور کچی پکائی دیگوں والوں کا گمان ہوتا ہے۔ گردن اتنی مضبوط اور چوڑی کہ طول بلد اور عرض بلد ناپنے کے لیے کسی ماہر پٹواری کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ جب چلتے ہیں تو لگتا ہے دو بندے ایک ساتھ چل رہے ہیں۔ روڈ رولر کی طرح ست الوجود ہیں اگر چھٹی بھی درکار ہو تو کہتے ہیں میں چھٹی لینا چاہتا ہوں۔ رُعب اور دبدبہ ایسا کہ بقول ان کہ اُنہیں دیکھ کر ان کی بھینس دودھ دینا چھوڑ دیتی ہے۔ چلتے وقت ان کا سر دائیں کاندھے کی طرف عموماً نوے (90) ڈگری کا زاویہ بناتا ہُوا نظر آتا ہے۔ ان کے چلنے پھرنے کی چال ڈھال دیکھ کر نہ جانے کیوں "چلتے ہو تو چین کو چلیئے" سفرنامہ یاد

ہمایون خان

آجاتا ہے۔ ہنسنے اور کھانسنے کا انداز بالکل ایسے جیسے رکشہ سٹارٹ ہو کر اچانک سے بند ہو جائے۔ درمیانہ قد، بڑا گول مٹول سر، بڑی بڑی آنکھیں، مختصر ناک، مضبوط کاندھے جنبش کھاتی ہوئی بڑی توند، بادامی رنگت اور گھنی مونچھیں ان کی شخصیت کو جلا بخشتی ہے۔ ہاں البتہ مونچھوں کی تراش خراش میں اتنی احتیاط سے کام لیتے ہیں جیسے دُنیا کا توازن ان کی مونچھوں پر قائم ہے۔ ہاں البتہ بالوں میں سفیدی ان کے ڈھلتے عمر کی شروعات کا اعلان ہے۔ خُوش شکل، خُوش لباس، خُوش مزاج اور خُوش آواز بھی ہیں۔ وسیع الاخلاق، روشن دماغ، متنوع المعلومات، ملنسار اور ہمدرد انسان ہیں۔ بڑے مہمان نواز ہیں، خدا ترس، شفیق، غریبوں اور فقرا کی مدد کرنے والے ہیں۔

کھانے کے بے حد شوقین ہیں۔ کھانا پہلے اور کلمہ بعد میں پڑھتے ہیں۔ کھانے سے پہلے ازار بند ڈھیلا کرنا ان کی تہذیبی عادت ہے مگر سٹائل ایسے بناتے ہیں جیسے پستول نکال رہے ہوں۔ سیاسی مفت چیزوں کی کھاؤ بگت میں ہمیشہ کچھ کر کے دکھاؤ اُصولوں پر قائم رہتے ہیں۔ بازار سے گُزرتے ہوئے لذیز کھانوں کی بو سونگھنے پر ناچاری میں دُور ہی دُور سے پکی پکائی چیزوں کی چُمیاں لیتے ہیں۔ گھر سے باہر اگر ایک کپ چائے بھی پیتے ہوں تو دس دفعہ حساب لگاتے ہیں کہ اِس خرچ سے آنے والی نسلوں پر کیا اثرات مرتب ہوں گے۔ حساب کے کھرے مگر خرچ سے پرے ہیں۔ مہینے کا جو بھی عشرہ ہو ATM ان کا خالی رہتا ہے۔ لیکن پیٹ ان کا ہر وقت بھاری رہتا ہے۔

سائنسی باتوں پر پختہ یقین رکھتے ہیں مثلاً ہَوا جگہ گھیرتی ہے اس لیے موصوف کھانے کے دوران منہ بند رکھتے ہیں۔ ان کو جب بھوک لگتی ہے تو علامتی اور غیر محسوس انداز اپنا کر یوں بولتے ہیں آج کل مردان کی بیلیاں فاقوں مر رہی ہیں۔ گرمی کی شدت کے باوجود شنکر کے کوّے روزانہ آب و دانہ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ پتھر کے اندر بھی کیڑے کو خوراک دیتے ہیں۔

اگرچہ مشکل پسند انسان ہیں لیکن انتہائی دلچسپ اور خُوش گُفتار بھی۔ اجنبیوں کے لیے الجبرے کا سوال جبکہ دوستوں کے لیے سسپنس ڈائجسٹ ہیں۔ ہر بات کا نقد اور انوکھا جواب دیتے ہیں۔ بقول ان کے ان کے دادا بچپن ہی سے ان کو اسد ابوگُفتار کے نام سے پکارتے تھے۔ درس و

تدریس ان کا پسندیدہ شعبہ ہے۔ ہر لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ نجانے کونسا گیدڑسنگی رکھتے ہیں کیوں کہ طلباء کے پسندیدہ لیکچرر ہیں۔ البتہ پیائش، آزمائش، آرائش اور زیبائش کا فرق آج تک واضح نہ کرسکے۔ اُردو کے لیکچرر ہونے کے باوجود وہ آج تک عصمت چغتائی، ادا جعفری، عشرت حسین، منور رانا اور مجید امجد کے حوالے سے غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ان میں کون مرد اور کون خاتون ہیں۔

اگرچہ ان کو اُردو پشتو اور انگریزی زبانوں پر گرفت حاصل ہے۔ لیکن اپنی زبان پر گرفت نہیں ہے۔ طویل گفتگو کے شوقین اور ماہر ہیں۔ بعض اوقات دوستوں کے ساتھ اتنی طویل گفتگو میں مصروف عمل ہو جاتے ہیں کہ اُنھیں یاد بھی نہیں رہتا کہ گھر سے آرہے ہیں یا جارہے ہیں۔ پیار عشق اور محبت پر نہ صرف یقین رکھنے والے ہیں بلکہ خود بھی عاشق مزاج واقع ہوئے ہیں۔ وہ الگ بات ہے کہ اپنی جوانی میں اظہار عشق و اقرار محبت میں اس قدر سست روی کا شکار تھے کہ جب تک اظہار خیال کرتے محبوبہ تین بچوں کی ماں بن چکی تھی۔

اسد صاحب علمی، ادبی، معلوماتی اور درس و تدریس کے حساب سے سنجیدہ، ذہین، فطین، قابلِ رشک اور محنتی انسان ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ سرسید کے گھرانے سے شجرۂ نسب ملتا ہے۔ نیک، متقی اور پرہیزگاری کا تو یہ عالم ہے کہ منٹو کے افسانوں میں تصوف اور سرسیّد کے اصلاحی مضامین میں مزاح تلاش کرتے ہیں۔ جبکہ نور جہاں کے گائے ہوئے ملی نغموں میں رومانیت اور جنسیت ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی مشورہ مانگے تو شیر کی خالہ بن جاتے ہیں اور ناخنوں کو چبانا شروع کردیتے ہیں۔ زمینداری ان کا خاندانی پیشہ ہے جس پر فخر کرتے ہیں۔ کاشتکاری کے بھی ہنر اور گُر جانتے ہیں۔ خود کو ڈاکٹر آف ویجیٹیبلز کہتے ہیں۔ کیوں کہ موسمی سبزیوں مثلاً بینگن، کدو اور بھنڈیوں کو ٹیکے لگا لیتے ہیں۔ کاروباری ذہن رکھنے والے ہیں اس لیے پیسوں کو گنتے وقت باربار اُنگلیاں زبان سے گیلی کرتے ہیں۔

ان کے تکیہ کلام میں مہمل الفاظ شامل ہیں جیسے لڑکی شڑکی، گورنر شورنر، تنخواہ منخواہ وغیرہ۔ لیکن اس قدر تن آسان کہ لفظ بیانی میں بھی یہی حال ہے کہ ایک دفعہ شعر بھی اس انداز میں پڑھا:

کی میرے قتل شل کے بعد اُس نے جفا شناسے توبہ
ہائے وائے اُس زود پشیماں نشیماں کا پشیماں ہونا

....

موسم گرما میں کالج کی چھٹیوں کے بعد ملاقات ہوئی تو اتفاقاً ہم دونوں کے بال کافی حد تک بڑھے ہوئے تھے تو مجھ سے بڑے رازدارانہ انداز میں مخاطب ہوئے کہ ہم دونوں ہم راز، ہم پیشہ، ہم خیال اور ہم جنس بھی ہیں تو کیوں نہ ایک ہی دُکان میں بال کٹوالیں تو ہم زلف بھی بن جائیں گے۔
اتنے صفائی پسند ہیں کہ کوئی میلی آنکھ یا پیلے دانت سے بھی دیکھے تو نہانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔
بڑے حاضر جواب اور حاضر دماغ ہیں۔
ایک دفعہ شاگرد نے کلاس میں سوال پوچھا کہ مکھن لگانا اور مسکا لگانا میں کیا فرق ہے؟ تو اپنی پیٹ اور پیٹھ پر ایک ساتھ ہاتھ پھیرتے ہوئے دانشمندی کے ساتھ کہا اگر لگانے والا مرد ہو تو ''مکھن لگانا'' اور کوئی محترمہ یا دوشیزہ ہو تو ''مسکا لگانا'' کہا جائے گا۔ خواتین کے معاملات میں ہشاش بھی اور بشاش بھی۔ فیشن ایبل اور صحت مند خواتین کو اتنی تشنہ نگاہی سے دیکھتے ہیں جیسے کوئی بچہ اپنی ماں کی گود میں دودھ پیتے ہوئے بھی فیڈر کو دیکھ کر بے چین رہتا ہے۔

میٹنگ میں خواتین کے سامنے ایسے باادب ہو کر حُسنِ سلوک کے ساتھ بیٹھے رہتے ہیں کہ گویا کسی کی تعزیت پر آیا ہو یا پھر پہلی دفعہ سسرال آئے ہوں۔
میٹنگ میں ایک خاتون نے پوچھا آپ کا اسم شریف کیا ہے؟ کہنے لگا ''اسد عرف مجروح'' خاتون نے پھر پوچھا آپ کا ''اسد قیصر'' سے کیا تعلق ہے۔ تو موصوف کہنے لگا جو تعلق نازیہ اقبال کا علامہ اقبال سے ہے۔ سلمیٰ آغاز کا وزیر آغاز سے ہے۔ اور بابرہ شریف کا نواز شریف سے ہے۔
اسد صاحب عموماً و معمولاً ماضی شکیہ میں رہنے والے انسان ہیں کیوں کہ عجیب و غریب قسم کے سوالات پوچھتے رہتے ہیں۔۔۔ جلیبی گول کیوں ہوتی ہے؟
نسوار کی تاریخ کیا ہے؟
پان کی دھار سُرخ کیوں ہوتی ہے؟
الغرض اپنی مدد آپ کے تحت کام کرنے والے فرض شناس شخصیت کے مالک ہیں لیکن تمام وزن دار خوبیوں اور صلاحیتوں کی بدولت ان پر ہر کام کے لیے بھروسا کیا جاسکتا ہے لیکن اتنا بھی نہیں کہ:

دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

☆☆☆☆☆

شہر سے پرے سرسراتی سرگوشی

رات کے دس بج چکے تھے۔ سڑک سنسان تھی اور سردی ایسی کہ کپکپاہٹ سے دانت بج رہے تھے۔ اندھیرا ایسا تھا کہ اپنا ہاتھ بھی دکھائی نہ دے۔ موسموں کے بارے میں دیہات والوں کی چھٹی حس حساس ہونے وجہ سے موسم کا مزاج جلدی جان لیتی ہے' اس لیے وہ شام سے پہلے ہی شہر سے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ نہر کنارے گامے کا چائے کا کھوکھا مگر جاگ رہا تھا۔ کھوکھے کے سامنے رکھے بنچ آباد تھے۔ میز پر گرم چائے کی رکھی پیالیاں ٹھنڈی ہونے لگی تھیں۔ گٹھ جوڑ منڈلی کے سب ارکان موجود تھے۔ یہ کھوکھا گامے نے شیدے کی بلہ شیری سے پکی سڑک کی تعمیر کا کام شروع ہونے پر بنایا تھا۔

گامے کا پورا نام غلام محمد اور شیدے کا عبدالرشید۔ عبدالرشید کو سڑک کے کام پر فور مین ہونے ناتے لوگ فور مین کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ غلام محمد نام پکارنے لوگوں کو قدرے دقت اور گامے کا نام سے پکارنا آسان تھا' یوں وہ گاما چائے والا کہلاتا تھا۔ سڑک پر کھوکھے کے دائیں ہاتھ تھوڑا چلنے پر نہر کا پل آتا تھا اور زیادہ چل کر بندہ شہر پہنچ جاتا تھا۔ کھوکھے کے عقب میں سڑک پر کام کرنے والے سٹاف کا عارضی کیمپ بنا تھا۔ کچھ مزدوروں نے بھی وہاں جھگیاں بنالی تھیں۔ سڑک کی تعمیر کا کام مکمل ہونے کے بعد کچھ مزدوروں نے جھگیوں کو رہائش گاہوں میں بدل لیا تھا۔ قبضہ گیری کے کھیل میں سٹاف کوارٹروں پر سٹاف کے لوگوں کا یہ حق فائق تھا۔ آنے والے حالات کو بھانپ کر فورمین عبدالرشید نے ایک گھر تعمیر کر کے کرایے پر چڑھا دیا تھا۔ کرایہ وصولی کی ذمہ داری اس نے گامے کو سونپ رکھی تھی۔ سال ڈیڑھ سال کے بعد کھڑے کھڑے آتا اور جمع شدہ رقم

اسلام عظمی

وصول کر کے واپس ہو لیتا۔ عبدالرشید ہر بار گامے کو کھوکھے کے پیچھے ایک گھر بنا لینے کا مشورہ دیتا۔ گاما جواب میں سڑک کنارے لگے ایک بورڈ کی طرف اشارا کر دیتا کہ سڑک سے ایک خاص حد کے اندر پختہ تعمیر خلافِ قانون ہے۔

'تمھارا کھوکھا بھی تو اس حد کے اندر ہے۔'

'مگر یہاں سے گزرنے والے ملازموں کو میرے کھوکھے سے چائے بھی تو مفت ملتی ہے۔ کھوکھا لکڑی کا بنا ہے اور اٹھا کر کہیں بھی لیجایا جا سکتا ہے۔'

.....

نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد عبدالرشید اپنے گھر میں آ بسا۔ بستی کے مکینوں کے لیے وہ عبدالرشید یا فورمین نہ تھا اور بستی میں اُس کی نئی پہچان 'شیدا' تھی۔ شام کے بعد وہ وقت گزاری اور چائے نوشی کے لیے گامے کے کھوکھے پر آ جاتا۔ شیدے کی دیکھا دیکھی چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے کے بعد ریٹائر ہو جانے والے اور لوگ بھی آنے لگے۔ کیونکہ اپنے گھروں میں اُنھیں بہوؤں کے پکے کھانے میں نقص نکالنے اور پوتے پوتیوں کو ڈانٹنے کے علاوہ کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ اللہ بخش کو لوگ بخشو کہتے تھے۔ عطااللہ کو جاہلوں نے سہولت کے لیے اللہ دتہ کر لیا ہوا تھا۔ یہ دونوں بھی نوکری پیشہ رہے تھے۔ کالو پہلوان کو پہلوانی کا شوق تھا مگر آس پاس کے گاؤں سے باہر اُس نے کبھی کوئی کشتی نہیں جیتی تھی۔ وہ ہتھ چھٹ ہونے کی وجہ سے کالو پہلوان کے نام سے مشہور تھا اور اپنی ہتھ چھٹی کی بنا پر سب اُس سے ڈرتے تھے۔

یہ چاروں کھوکھے پر آ جاتے تو گاما اُن کے سپیشل چائے بناتا۔ سپیشل چائے کے دام الگ تھے۔ گاہکوں کی آمد و رفت کم ہو جاتی تو گاما دوسری چائے گاما اپنی طرف سے پلاتا اور ساتھ میں پکوڑیاں بھی رکھ دیتا۔ وہ گپ شپ سے دل بہلاتے اور وقفوں سے چائے کی چسکیاں لیتے رہتے۔

یہ ہنر سرکاری نوکریوں سے اخذ کردہ تجربے کا نچوڑ تھا۔ کام کی بات کرنے کا رواج نہ تھا اور کسی کتاب میں ایسا لکھا بھی نہ تھا۔ موبائل عام ہو چکے تھے اور سب نے کئی موبائلی گروپوں کے نام سن رکھے تھے۔ اُن کے دل میں بھی گروپ بنانے کا خیال جاگ اُٹھا اور اُنھوں نے 'گٹھ جوڑ گروپ' بنا ڈالا۔

کالو پہلوان نے اعتراض کیا کہ ہم تو صرف پانچ ہیں۔ شیدے نے جواب دیا کہ سیاست میں تانگہ پارٹیاں بن سکتی ہیں تو پانچ ہم خیالوں کا گٹھ جوڑ گروپ کیوں نہیں۔

گروپ بن تو سوال اٹھا کہ گروپ کا صدر کون۔ الیکشن کی جھک جھک اور بک بک میں پڑنے کے بجائے متفقہ طور پر فیصلہ ہوا

کہ گامے کو پارٹی کا صدر مان لیا جائے۔ کیونکہ ہم اُس کے کھوکھے پر اکٹھے ہوتے ہیں۔ بینچ اور میز اُس کے ہیں۔ وہ مفت چائے پلاتا اور خستہ پکوڑیاں بھی کھلاتا ہے۔ صدرِ محترم کی عزت افزائی کے لیے طے کیا گیا کہ صدرِ محترم کو پورے نام 'غلام محمد' سے مخاطب کیا جائے گا۔ غلطی سے بھی گامے کا شبد بولنے والا جرمانہ ادا کرے گا۔

گھ جوڑ منڈلی کے سبھی رُکن عمر کے اُس موڑ پر تھے کہ گھر والے بھی اُن کی بات سن کر ہنکارا نہیں بھرتے تھے۔ یہ سب حالات کی دین تھا۔ اُن کے بچپن میں بوڑھے لوگ مقامی دانش وروں کی طرح ہوتے تھے۔ کسی بات کی سمجھ نہ آتی تو لوگ بابوں کی طرف دوڑتے۔ یہ رواج ختم ہو چکا تھا۔ ڈھلی عمر کا فرد گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتا تو پھبتی کسی جاتی 'بڈھا ایکٹنگ خوب کرتا ہے۔'

گپ شپ اُن کے لیے قدرتی نفسیاتی ٹانک کا کام کرتی۔ بے سبب قہقہے لگانے کے عمل نے انھیں کڑوی بات برداشت کر لینے کا حوصلہ بھی عطا کر دیا تھا۔

....

جب شیدے کے علاوہ اور کوئی نہ آتا' وہ دن آپ ہی آپ اس سے کو یاد کرنے کا دن بن جاتا' جب پکی سڑک کی تعمیراتی کمپنی نے یہاں سائٹ آفس بنایا تھا اور دور سے آنے والے مزدوروں نے عارضی ٹھکانے بنائے تھے۔ وہاں گامے کی جھونپڑی پہلے سے تھی۔ وقفے کے دوران کئی مزدور گامے کی جھونپڑی میں آ جاتے اور حقہ نوشی میں شریک ہو جاتے۔ کش لگا کر کوئی دھواں فضا میں موسم کے بارے معصوم سی ڈر فنطیاں 'سردی کڑا کے کی ہے..... بھرپور گرمی ابھی نہیں آئی...... جیٹھ کنیا تے سو دن گنیا جیٹھ کے مہینے میں بارش ہو گئی اگلی بارش سو دنوں کے بعد ہی ہو گی وغیرہ قسم کے جملوں تک محدود رہتیں۔

گامے کی غیر موجودگی میں کوئی شک ظاہر کرتا کہ گاما سرکاری جاسوس ہے جو علاقے میں کسی قاتل کا سراغ لگا رہا ہے۔ نہیں تو یہ دیہاتوں کو شہر سے ملانے والے کچے رستے پر اکیلا کیوں رہ رہا ہے۔ ایک تجسس یہ بھی تھا کہ گاما شادی کی عمر میں اکیلا کیوں ہے!

تجسس کا مارا کوئی مزدور گامے سے پوچھنے لگتا۔

'شادی کی عمر میں ہو کر بھی تم اکیلے کیوں ہو؟'

جواب میں گاما مسکرا دیتا۔

مسکراہٹ ذو معنی بیانیہ ہے۔

بچہ نیا کھلونا دیکھ کر مسکراتا ہے۔

قاتل کاری وار کرنے کے بعد۔

کسی کا رزق دوسروں کو ہنسانے سے وابستہ ہے تو کوئی دوسروں کو رلا کر خوش رہتا ہے۔ مزدوروں کو باتوں کی گہرائی میں جانے کی ضرورت تھی اور نہ ہی اُن میں یہ صلاحیت۔

پانی' لسی اور شربت کا دور تھا۔ مہمان آتا تو

گاؤں والے دودھ کا گلاس پکڑا دیتے۔ دودھ میں ملائی ہوتی تو مہمان دودھ پی کر مونچھوں پر تاؤ بھی دیتا۔ تب چائے بیچنے والی کمپنیوں کے ایجنٹ فعال ہو چکے تھے۔ لوگ 'چائے سردیوں میں گرمی اور گرمیوں میں ٹھنڈک بخشتی ہے'..... قسم کے سلوگنوں پر ایمان لانے لگے تھے۔

عبدالرشید کام کا نگران تھا۔ حقہ نوشی کے لیے وہ بھی گامے کی جھونپڑی میں آجاتا۔

اس روز ہوا سرد تھی۔ کچھ وقت گزار کر اُس نے شیدے سے کہا۔

'گامے یار چائے تو بناؤ۔'

'چائے!..... وہ کیا ہوتی ہے!'

اگلے ایک مزدور ایک تھیلا تھامے گامے کی جھونپڑی میں داخل ہوا۔

'تھیلا فورمین صاب نے بھیجا ہے۔'

'تھیلے میں کیا ہے!'

'مجھے کیا خبر!'

تھیلے میں ایلومینیم (جسے تب لوگ سلور کہتے تھے) کی کیتلی، دیسی چینی کی پیالیاں، چائے کی پتی کا پیکٹ تھا۔ گامے کو یہ جاننے میں دیر نہ لگی کہ یہ چائے بنانے کی فرمائش ہے۔ گامے کے پاس چولھا اور لکڑیاں تو تھیں۔ گڑ بھی تھا مگر دودھ نہ تھا۔

نہر کے پل کے پاس البتہ نہر کے اہلکاروں کے دو تین کوارٹر تھے۔ ایک کوارٹر والے نے بھینس بھی پالی ہوئی تھی۔ بھاگ کر وہاں سے دودھ کا گلاس مانگ لایا۔ اُن دنوں مانگے سے ضرورت کی ساری چیزیں ماسوائے چڑیا کے دودھ کے مل جاتی تھیں۔

گامے نے تب تک چائے نہیں پی تھی۔ اندازے سے چائے بنائی اور فورمین کو بلا بھیجا۔ فورمین نے چائے کا گھونٹ بھرا اور کہا۔

'گامے تو پہلے ٹیسٹ میں کامیاب ہو گیا ہے۔ چائے سوادی ہے مگر میٹھا تھوڑا کم۔'

گامے ہنس پڑا۔

'فورمین جی' آپ نوکری والے ہو۔ نوکری والے کام میں مین میخ نہ نکالیں' اُنھیں واہ واہ نہیں ملتی۔'

گامے کی بات سے شیدا جان گیا کہ جوڑ برابر کا ہے۔ یہ اُن کی دوستی کا آغاز تھا مگر دونوں نہیں جانتے تھے کہ ساتھ بہت دور تک چلنے والا ہے۔

'گامے' تمھارا نام غلام محمد لگتا ہے!'

'نام تو غلام محمد ہی ہے۔ دادی نے یہی نام رکھا۔ زمانے نے گاما کر دیا ہے۔ اپنے نہیں رہے تو کوئی بھی نام چل سکتا ہے۔'

چند مزدور بھی جھونپڑی میں تھے۔ سوائے عبدالرشید کے کسی کی سمجھ میں گامے کی بات نہ آئی۔ اگلے روز ایک اور مزدور گڑ کی چھوٹی بوری لے آیا۔

شیدا چائے پینے کے لیے گامے کی جھونپڑی میں آیا تو گامے نے بتایا۔

'آپ کیتلی بہت بڑی لے آئے ہو۔'

'جان بوجھ کر لایا ہوں۔ زیادہ چائے بنا لیا کر۔ ٹھنڈ مزدوروں کو بھی لگتی ہے۔ وہ بھی پی لیا کریں گے۔'

'بات تو اچھی ہے مگر خرچہ بھی تو ہے۔'

'خرچہ مزدوروں کی جوتیوں کا صدقہ ہے۔'

.....

بہت دنوں کے بعد گامے کو پتا چلا کہ ہر مہینے مزدوروں کی تنخواہ سے پانچ روپے کاٹے جاتے ہیں۔ جمع شدہ رقم سے افسروں کو حصہ بقدر جثہ ملتا ہے۔ اپنا جو حصہ نہ لے وہ بُرا کہلاتا ہے۔ ہر لوگ برا کہلانا پسند نہیں کرتے تھے اور اچھے کاموں میں خرچ کر دیتے تھے۔ شیدا اُن میں سے ایک تھا۔ شیدے نے گامے کو کھوکھا بنا کر چائے بیچنے کا مشورہ دیا جو اُس نے مان لیا۔ سڑک کا کام مکمل ہو گیا تو کارکن اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔

گامے کے پاس لوٹنے کے لیے کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ وہیں ٹِکا رہا۔ اچھی بات یہ ہوئی تھی کہ سڑک پر سے گزرنے والوں کی تعداد بڑھنے۔ لوگ چائے نوشی کے لیے کھوکھے پر رُکنے لگے۔ کھوکھے پر رُک کر چائے پینے کے بعد گھر سے خالی پیٹ نکلنے والے مسافر نے گامے کو چائے کے ساتھ کھانے کے لیے بھی کچھ رکھنے کا مفت دیا۔

'بھیا' ہم کورٹ کچہریوں میں دھکے کھانے والے لوگ گھروں سے خالی پیٹ نکلتے ہیں۔ چائے کے ساتھ کھانے کے لیے بھی کچھ رکھ لو۔ ہمارا پیٹ بھر جائے گا اور تمھارے وارے نیارے ہو جائیں گے۔'

گاما اکیلی جان تھا اور لالچی نہ تھا۔ کسی کام سے شہر گیا تو پکوڑیاں کی ایک دکان کے سامنے سے گزرا۔ دکاندار پکوڑیاں تل کر ایک تھال میں ڈالتا جا رہا تھا۔ پکوڑیوں کی سوندھی خوشبو سے جی للچایا تو پچیس پیسے کی پکوڑیاں خرید لیں۔ پکوڑیاں سوا دلی تھیں اور اتنی..... کہ گامے کا پیٹ بھر گیا۔ چائے کے ساتھ کچھ رکھنے کی بات یاد آئی۔ پکوڑیوں والے کو بتایا۔

'گاؤں جانے والی سڑک پر میرا چائے کا کھوکھا ہے۔ جی چاہا ہے کہ کھوکھے پر پکوڑیاں رکھ لوں۔'

'تو رکھ لو۔'

'مشکل ہے۔ کھوکھے پر اکیلا ہوں۔ پکوڑیاں خرید کر لیجانے کا جو وقت ہے' وہ کھوکھے پر گاہکی کا سمے ہے۔'

دکاندار ہنسا۔

'ارے یار' کس دنیا میں تم رہتے ہو۔ دن چڑھنے سے پہلے دیہاتی گوالے بھینسوں کا دودھ شہر میں بیچنے کے لیے آتے ہیں۔ واپسی پر کسی کو بھی تمھارے لیے پکوڑیوں کا پارسل تھما دوں گا۔ تم پکوڑیاں خریدنے کی بات کرو۔ تمھارے کھوکھے پر پکوڑیاں

پہنچانے کی ذمہ داری میری مگر؟'

'مگر کیا؟'

'بدلے میں تمھیں اُسے چائے مفت پلانی پڑے گی ہر روز۔ جانتے ہو مفت میں تو کوئی وڈی انگلی پر نہیں موتتا' ...... دکاندار نے کہا۔

کٹی انگلی پر مفت پیشاب نہ کرنے والا محاورہ پرانا تھا۔ ہسپتال بھی نہ ہونے کے برابر تھے۔ لیکن مفاد پرستی تب بھی تھی۔

گامے کو یاد آ گیا کہ ایک گوالا تو شہر جاتے ہوئے اُسے دودھ بیچ کر جاتا ہے۔ گامے نے دکاندار کو اُس گوالے کا نام بتایا۔ دکاندار نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ گامے نے دکاندار نے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ سودا پکا ہو گیا۔

....

چائے کے لیے رُکنے والوں کی نظر پکوڑیوں پر پڑتی تو منہ میں پانی بھر آتا۔ جی للچاتا۔ میٹھے اور نمکین کا جوڑ پرانا تھا۔ شادی بیاہ کے موقعے پر گڑ کے زردے پر شوربا ڈال کر چسکا لینے کا رواج عام تھا۔ لوگ رُکتے' چائے پکوڑیوں سے بھوک مٹاتے اور چل پڑتے۔ دن بھر کورٹ کچہریوں میں وکیلوں' ججوں کے نخرے اٹھاتے رہتے۔ واپسی پر کھایا پیا ہضم ہو چکا ہوتا۔

کھوکھے پر پھر رُکنا پڑ جاتا۔ جلد ہی گامے کو گاہکوں کے لیے دو بنچ اور ایک میز بنوانا پڑ گئی۔ لوگوں کی آمد و رفت لگی رہتی۔ دھندا چلتا اور گامے کا جی بہلا رہتا۔

پھر گاما اپنی جھونپڑی میں کھوکھے کے پچھلے حصے میں گھس کر لیٹ جاتا۔ نیند آنے میں دیر نہ لگتی۔ کسی روز دیر ہو جاتی تو یادوں کا دریچہ کھل جاتا۔

میں نے اک بار ہی دیکھا تھا پلٹ کر پیچھے ساتھ کیا کیا دَر و دیوار چلے آئے ہیں تے تو بند ہونے کا نام ہی نہ لیتے۔

....

حسبِ معمول گٹھ جوڑ گروپ کے سبھی اراکین گامے کے کھوکھے پر جمع تھے۔ وقفے وقفے سے وہ چائے کی چسکی بھرتے اور بے پَر کی اُڑاتے۔ مارکیٹ میں بے پَر کی خبروں اور پَر والے کھلونوں کی بھرمار تھی۔ آپسی تُو تکار ہنر کا درجہ اختیار کر چکی تھی۔ دس میں دس ہی اِسے عوام میں بے چینی کا سبب مانتی تھی۔ کچھ دن پہلے کسی نے سوال اُٹھایا تھا کہ امن برباد کرنے والوں کے کان کیوں نہیں کھینچتی۔ 'کان کھینچنے سے نہیں ہوتا' ...... شیدے نے یہ کہہ کر بتایا تھا کہ ایک برطانوی پارلیمنٹ صحافی برنارڈ شاہ نے اخبار میں چھاپا تھا ...... 'برطانوی پارلیمنٹ کے آدھے ارکان گدھے ہیں' تو ایک ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور برنارڈ شاہ کو اخبار میں بحروفِ جلی تردید چھاپنا پڑ گئی تھی ...... 'ہماری پارلیمنٹ کے آدھے ارکان گدھے نہیں ہیں۔'

یوں گٹھ جوڑ گروپ کا کوئی رُکن حالات

ناظرہ کے حوالے سے کوئی چٹکلا چھوڑ دیتا۔ پھر ہر کوئی اپنی بساط کے مطابق کچھ ہانکتا اور شیدا بات میں کچھ نیا ٹانکتا۔ برسوں پرانی روایت کے مطابق چائے نوشی کا دور چلتا رہتا تھا۔ مگر کم روشنی کی وجہ سے کوئی بھی یہ نہ جان سکا کہ گاما کسی سوچ میں ہے۔ شہر میں دنگل برپا کرنے کی بات چل رہی تھی۔ جوڑوں کے پرانے درد کی وجہ سے کالو پہلوان دنگل میں شرکت نہیں کر سکتا تھا' مگر اِس اطلاع نے اُس کے اندر سوئے پہلوان کو جگا دیا تھا۔ لہجے میں بجلیاں تھرکنے لگی تھیں۔ اُس نے آتے ہی کہا تھا۔

'رات بھر کی سوچ بچار کے بعد میں اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے قومی زوال کا باعث پرانی قدروں کی ناقدری ہے۔ پہلوانی کا فن رو بہ زوال ہے۔ اولمپیائی کشتیاں بھی کوئی کشتیاں ہیں۔ نہ ڈھول نہ ڈھمکا۔ نہ اکھاڑے کے گرد تالیاں بجانے والوں کا دائرہ۔ پہلوان تو رقص کرتا ہوا اکھاڑے میں اترتا ہے۔ واشنگ فیکٹریوں کے کھلنے سے 'دھوبی پٹڑے' لفظ ہی بول چال سے حذف ہو گیا ہے۔ دنگل کے اعلان پر آیئے' مل کر دھمال ڈالیں۔'

کالو پہلوان دھمال ڈالنے کے لیے اُٹھا مگر جوڑوں کے درد کی ٹیس نے اُسے بٹھا دیا۔ باقی دوسرے بھی دنگل دیکھنے کے شوقین رہے تھے' اُنھوں نے چمچوں سے پیالیاں بجانا شروع کر دیں۔ پیالیاں ٹوٹ جانے کے ڈر سے گامے نے پیالیاں کھڑکانے کے عمل میں حصہ نہ لیا۔ شیدے نے گامے کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

'جنابِ صدر' مزاجِ دشمناں ناساز تو نہیں!'

کالو پہلوان طیش میں آ گیا۔

'شیدے' دوست کے لیے دشمن بولنا ٹھیک نہیں۔'

سب نے کالو پہلوان کی بات کی تائید کی۔ شیدے نے بات کی وضاحت کرنے سے پہلے اپنا کھنگار کر صاف کیا۔

'پیارے دوستو' شاید تم بھول چکے ہو کہ 'مزاجِ دشمناں ناساز ہے' سلیقے سے مزاج پرسی کا سلیقہ ہے۔'

'یہ پہلے بتانا تھا'..... کالو پہلوان نے احتجاجاً کہا۔

'کیا تم کبھی کراچی نہیں گئے!'

'جاتا رہتا ہوں۔ مگر ماے کے گھر سے کچھ دن رہ کر واپس آ جاتا ہوں۔'

شیدا مسکرایا۔

'دوست' تم نے پہلوانی کے فن کے انحطاط کے بارے میں خدشات کا اظہار کیا ہے۔ افسوس کہ اَدب کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ بہتر ہے کہ ادبی منظر اور پس منظر پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔'

'روشنی کیسے ڈالو گے۔ دیکھتے نہیں کم وولٹیج کے سبب بلب ٹمٹما رہا ہے۔'

'سنا ہے کہ سولر پینلوں سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا'..... غلام محمد نے کہا۔

اُس روز شیدے کے ہاتھ ایک ادبی تحریر لگ گئی تھی اور وہ اس بارے گفتگو کرنے کے لیے اور اپنے علم کی دھاک جمانے کے لیے بے تاب تھا۔ اُس نے روشنی کی بات سنی اَن سنی کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

'مانا جاتا ہے کہ کہانی نے اپنی روایت ترک کرتے ہوئے افسانی چولا پہنا تو..... 'ایک تھا بادشاہ ایک تھی ملکہ' والی تکنیک اپنی موت آپ مر گئی۔ 'واوین' میں پرانا لفظ لکھ نئے مفاہیم کا سفر شروع ہوا ہی تھا کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ طے ہوا کہ اَب پاک باتیں ہی لکھی جائیں۔ قدرت اللہ شہاب نے 'الحمدللہ' لکھا۔ اشفاق احمد نے 'گڈریا'۔ سعادت حسن منٹو نے 'کھول دو' لکھ کر بے حسی کا بیانیہ بتایا اَور پھر ایک ننگی حقیقت پر ننگا افسانہ 'کالی شلوار' لکھ مارا۔ لکیر کے فقیروں نے بڑے گھر شکایت لگا دی۔

'منٹو نے شلوار کے بارے میں اُلٹی سیدھی بات لکھی ہے۔ قانونی لوگ کوٹ پتلون پہنتے تھے۔ پھر بھی وہ سوچ میں پڑ گئے۔ امکانی فحاشی کی روک تھام کے مطالبے نے زور پکڑا تو..... 'مجرم حاضر ہو' کا نوٹس نکل گیا۔ عدالت گناہی اور بے گناہی تولتی ہے۔ آغاز مقدمہ ہی میں ایک دانا نے سوال اٹھا دیا..... 'کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے یہ طے کرنا اشد ضروری ہے کہ فحاشی کیا ہے!'

نیتوں کا احوال اُوپر والا جانتا ہے۔ ملزم کی 'نیت' ملزم خود جانتا ہے۔ اَنتہاس بتاتا ہے کہ ایسی ابحاث گڑے مردے ہی اکھڑتے ہیں۔ یہ بھی بھول جاتا ہے کہ ہم چلے کہاں سے تھے اور جانا کہاں ہے۔ یار لوگوں نے اِسے علمیت بگھارنے کا نادر موقع جانا۔ استغاثے کی غزل کے جواب میں دو غزلے' سہ غزلے اور چہار غزلے لکھے جانے لگے۔ دندان شکن جملوں اور ذو معنی محاوروں کی یلغار سے اُکتا کر گھبرا کر اعلان ہوا۔

'جاؤ بابا جاؤ۔ ہمیں اور بھی قضیے نپٹانے ہیں۔'

کئی منٹ بے رُکے بولنے سے شیدے کی سانس پھول گئی تھی۔ وہ سانس لینے کے لیے رُکا تو آواز آئی۔

'شیدے' تُو نے یہ کیا ہزار داستان شروع کر دی ہے۔ تیری بات شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ پیالیاں خالی ہو چکی ہے۔ مہنگائی بڑھ چکی ہے۔ تم بولے جا رہے ہو۔ تیرے بڑوں نے تجھے نہیں بتایا کہ وقت قیمتی ہوتا ہے۔'

.....

شیدے نے آواز کی سمت دیکھا۔ اُدھر

کوئی نہ تھا - احتیاطاً سارے چہروں کو گھورا۔ سب پریشان تھے۔ پھر بھی احتیاطاً پھر نیچے اُوپر اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ کچھ نظر نہ آیا تو غصّے سے لال پیلا ہو گیا۔

'کون بولا۔ کس نے ٹوکا۔'

'کوئی نہیں بولا۔ ایسا لگتا ہے کہ ترے کان بجتے ہیں'..... اِس بار آوازے کے ساتھ زوردار قہقہہ بھی تھا۔ شیدے سمیت سب حیرت میں ڈوب گئے۔

.....

اماوس کی راتوں میں جنوں بھوتوں اور چڑیلوں کی چہل قدمی والی کہانیوں کا زمانہ لد چکا تھا۔ اَب تو موبائل فونوں نے آفت مچائی ہوئی تھی۔ لوگ جیب میں موبائل فون رکھے اور کان میں بلیوٹوتھ دبائے اپنی پسند کی موسیقی سُن کر وَجد میں سر ہلاتے رہتے - کوئی کسی کو دیکھ کر تعجب نہ کرتا۔ انہونیوں کا راج تھا۔ بارش ہوتی تو لگتا کہ آسمان پھٹ پڑا ہے۔ کوئی بتاتا کہ یہ سب راگ ملہار کا کیا دھرا ہے۔ بے وقتے راگ تھے کہ بند ہونے کا نام ہی نہیں لیتے تھے - آوازوں اور لہجوں کے ردّ و بدل کا چلن عام تھا۔

نظریں دائیں بائیں اور قریب و دور دَوڑ رہی تھیں مگر کسی نتیجے پر پہنچ نہیں پا رہا تھا۔ ایسے میں کون جان پاتا کہ گامے کے چہرے پر اُداسی ہے۔ گاما کچھ بتانا چاہ رہا ہے مگر بتا نہیں پا رہا تھا۔ وہ تو اگلے دن کے لیے پکوڑیوں کا آرڈر کینسل کر چکا تھا۔

غیبی آوازے آ رہے تھے مگر کوئی جان نہیں پا رہا تھا کہ کہاں سے۔ آس پاس کوئی پتلی گلی بھی نہ تھی کہ جملہ پھینکنے والا نکل لے۔ حیرتی کم نہیں ہو رہی تھی۔ آخر کار غلام محمد عرف گامے نے کہا 'یارو' آج کے دور میں کچھ بھی قابلِ بھروسہ نہیں رہا۔ لب ایک کے ہلتے ہیں اور بولتا دوسرا ہے۔ مصنوعی ذہانت کا دور ہے۔ تشکیک بیکار ہے۔'

'مگر بولنے والا نظر تو آنا چاہیے۔'

'بولنا بولنے والوں کی مجبوری ہے مگر ماننا نہ ماننا تو تمھارا اختیار ہے۔'

'سچ کہا۔ سچ کہا۔ سچ کہا'..... آوازہ سلوموشن میں دہرانے لگا۔

'آوازہ کہاں سے آ رہا ہے!'..... پھر شور مچ گیا۔

'کوئی آوازہ نہیں۔ تمھارے کان بج رہے ہیں'..... آوازے کا جواب تھا۔

.....

سننے والے کان موجود تھے - دیکھنے والی آنکھیں موجود تھیں..... مگر بولنے والا غائب۔ خوف کی لہر تھرتھرانے لگی۔ تشکیک رینگنے لگی تھی۔ سب کانپنے لگے۔

'سردی بہت بڑھ گئی ہے۔ آج کی ملاقات بس اتنی۔ محفل برخواست کر دینی چاہیے۔'

'گھروں کو لوٹ جانا چاہیے'..... آوازہ آیا۔

'گھروں کو لوٹ جانا چاہیے'..... کالو پہلوان

گھبرایا ہوا تھا۔ شیدے نے کہا۔
'غلام محمد' بے شک گھروں کو لوٹ جانا چاہیے مگر خدشہ ہے کہ گھروں تک لوٹنے تک اِس ٹھنڈ کی وجہ سے ہمارے جسم یخ ہو کر اکڑ نہ جائیں۔ چائے کی ایک ایک پیالی اور.....'
غلام محمد نے نظریں جھکالیں۔
'دوستو' جی میرا بھی چاہتا ہے کہ آخری ملاقات یادگار بن جائے - مگر دو نمبر کی چائے کی پتی کی قیمتیں بھی آسمان کو چھو رہی ہیں۔ خالص دودھ' چڑیا کا دودھ لانے کے مترادف ہے۔ آسٹریلوی گایوں کا دودھ ڈالروں میں بکتا ہے - خریدنے اور بیچنے کے بیچ کے وچولے بڑھتے جا رہے ہیں۔ آج کی چائے آخری تھی۔'
'کیا کہا!'
'جو تم نے سنا۔'
'مگر کیوں!'
'سڑک سے بستی تک کی جگہ پک چکی ہے۔'
'مگر یہ زمیں تو شاملاٹ ہے۔'
'شاملاٹ کا لفظ متروک ہو چکا ہے۔'
'یہ کیسے ہو سکتا ہے!'
'ہو سکتا ہے۔ جانتے ہو دنیا ستاروں پر کمندیں ڈال کر کہیں آگے نکل چکی ہے۔ ہمارے لوگ کیا اتنے گئے گزرے ہیں کہ دور پار کے خالی پلاٹ پر قبضہ نہ جتا سکیں۔'
غلام محمد نے کھنگار کر اپنا گلہ صاف کیا اور وضاحت کی۔
'میرے کھوکھے سمیت بستی کی دیوار تک کی جگہ کسی کو الاٹ ہو چکی ہے۔ الاٹی کے کارندے مجھے خود یہ بتا کر گئے ہیں۔ کارندوں کا لہجہ ملائم تھا مگر آنکھیں! تجاوزات کے حکم کے تحت مجھے کھوکھا ہٹانے کا نوٹس موصول ہو چکا ہے۔ میں کھوکھا بشمول سامان بیچ چکا ہوں۔ خریدنے والا کل آئے گا اور سامان گاڑی میں بھر کر لے جائے گا۔ نہ بانس رہے گا نہ بانسری۔'
'گامے کہاں جائے گا!'
غلام محمد کے بجائے 'گامے' کے تخاطب نے اُسے کچھ مایوس کر دیا۔ گامے نے آنکھیں بند کر کے کھولیں۔ پھر کہا۔
'یارو' نقدیریں رونے دھونے سے نہیں بدلتیں۔ 'آج کی چائے آخری ہے' میں یہ کچھ پہلے بھی بتا دیتا تو کیا ہوتا! ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ پہلے بتا دینے سے آخری رات کی گپ شپ کا مزہ کرکرا ہو جاتا۔ آخری سانس تک مسکرا لینے میں آخر حرج ہی کیا ہے!'
'کیا حرج ہے! کیا حرج ہے!'..... آوازہ دہرانے لگا۔ دلوں میں دُکھ تھا۔ آنکھوں میں نمی تھی مگر آنسوؤں میں ٹپکنے کا یارا نہ تھا۔ گامے نے زور سے دایاں پاؤں زمین پر مار کر اور دایاں ہاتھ اُٹھا کر سلیوٹ کیا۔
'گڈ جوڑ گروپ کے صدر 'غلام محمد' کی طرف سے خدا حافظ۔'

☆☆☆☆☆

''سچی محبت کی طاقت''

بلقیس ریاض

سعید صاحب کا بنگلہ چاروں طرف قمقموں سے سجا ہوا تھا... کوئی تقریب ہو نہ ہو.... مگر شام ہی سے قمقمے روشن ہو جاتے تھے... آج تو ان کے تمام دوست یعنی کلاس فیلوز دعوت پر آ رہے تھے... ان سب سے زیادہ سعید صاحب صاحبِ حیثیت تھے.... شاندار گھر کے بیک سائیڈ پر باغ جہاں رنگا رنگ کے ہر موسم کے پھول اور بڑے بڑے پھولوں سے بھرے درخت.... ہوا کے ہلکوروں میں جھوم رہے تھے... ایک کونے میں جا بجا سنگ مرمر کے بینچ اور اس کے قریب بہتی ہوئی آبشار عجب سماں پیش کر رہی تھی.... دوسری جانب فوارے اپنے پورے جوبن پر تھے کئی رنگوں کے بلب آس پاس لگے تھے جن کا عکس پانی پر پڑ رہا تھا.... خراماں خراماں سب دوست پہنچ چکے تھے.... سعید صاحب اپنی ڈرائنگ روم میں نہیں آئے تھے... تھوڑی دیر کے بعد آئے سب سے بغل گیر ہوئے اور باتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

سعید عاظم محفل میں بیٹھے ہوئے تھے.... اپنی قابلیت کے گن گاتے ہوئے دوستوں کو مرعوب کر رہے تھے.... ''جو کچھ بھی ہوں جس مقام پر کھڑا ہوں وہ میری ذاتی محنت

ہے....بس محنت کے بل بوتے پر ایک فائیو سٹار ہوٹل اور کاٹن کی فیکٹری.... جہاں لاکھوں نہیں تو ہزاروں لوگوں کو بھرتی کیا ہوا ہے....دو بچے ہیں جو کچھ کمایا ہے وہ انہی کا ہے....دونوں کو باہر کے ملک پڑھنے کیلئے بھیج دیا ہے تاکہ باپ دادا کا نام روشن کر سکیں....ان کے قریب ہی ہم پیالہ ہم نوالہ زمان صاحب جو ان کے بہت ہی گہرے دوست تھے اور مستقبل میں ان کے سمدھی بننے والے تھے....اپنے بیٹے کا رشتہ ان کے ساتھ طے کر چکے تھے....اور بیٹی کی ابھی تک کہیں نسبت نہیں ٹھہرائی تھی۔

فضا بڑی ہی حسین اور دلنشین سعید صاحب کی باتوں سے ہو رہی تھیں۔ باقی کے دوست ان کی امارت سے مرعوب ہو کر دل ہی دل میں حسد سے خاموش بیٹھے تماشائی کی طرح ان کی گفتگو سن رہے تھے....مگر کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ کوئی ان سے سوال جواب کرے....کیونکہ ان کی فیکٹری میں کسی کا بھانجا کسی کا بیٹا....یا وہ خود وہاں کسی نہ کسی جاب پر فائض تھے....ہر ایک ان کی باتوں سے ہاں جی...ہاں جی ...بالکل درست کہہ کر ان کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے....آخری صوفے پر ایک پرانا دوست جو سلیم کسی کالج میں پروفیسر تھا....اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہنے لگے....دیکھو تو سہی سارا دن مغز ماری کالج میں کرتا ہے....میں نے کہا دستبردار ہو جاؤ اور میری فیکٹری میں بطور منیجر کام کرو..... پر نہیں....اپنی علمی لیاقت پر زعم ہے....کیا ملتا ہے پروفیسری میں....مگر اس کو کون سمجھائے....ایک یہ اور ایک دوسری میری بیٹی ثانیہ جن کو انکل پروفیسر بہت اچھے لگتے ہیں....خود بھی ایم اے کے بعد کالج میں نوکری کرنا چاہتی تھی مگر میں نے سختی سے اسے باہر بھیج دیا تاکہ وہ بھی اپنے پاؤں پر کھڑی ہو کر بزنس کے معاملات میں میرا ہاتھ بٹائے...بزنس آف ایڈمنسٹریشن کر رہی ہے....بیٹے کے پاس بھی یہی subject ہے وہ تو فیکٹری کے معاملات سنبھالے گا....اور سلیم کے بیٹے عاصم نے باہر جانے سے انکار کر دیا اور یہیں پر تعلیم حاصل کر رہا ہے....وہ بھی اگر جاتا تو اپنے ساتھ اعلیٰ ڈگری لے کر آجاتا....مگر نہیں ناک کا مسئلہ آڑے آیا ہوا تھا باپ بیٹا میرا احسان نہیں لینا چاہتے تھے....چلو کوئی بات نہیں باپ کی طرح وہ بھی کہیں پروفیسری کر لے گا۔

باتوں ہی باتوں میں وقت کا پتہ نہ چلا اور کھانا میز پر چنا گیا سب نے رغبت سے کھایا....کھانے کے بعد باری باری سب چلے گئے تو زمان نے کہا۔

''سعید صاحب کے سامنے میں کچھ کہنا نہیں

چاہتا تھا دراصل میرا بیٹا اپنے پاؤں پر اپنی محنت سے کھڑا ہونا چاہتا ہے.....جو اس کے نصیب میں اللہ نے لکھ دیا ہو گا وہ اس کو یہاں ہی مل جائے گا اور نہیں ملنا تو باہر سے پڑھ کر بھی نہیں ملے گا“۔

کیسی دقیانوسی باتیں لے بیٹھے ہو.....باہر کی اعلیٰ ڈگری میں جو شان ہے.....وہ کہیں نہیں ملتی.....جتنی بھی محنت کر لے.....اس کا برائٹ مستقبل نہیں ہو سکتا۔

”لیکن...کیا خبر قسمت میں کیا لکھا ہے“۔

”قسمت ہم خود بناتے ہیں.....محنت کرتے ہیں.....پھر وہی ملتا ہے“۔

”مجھے اللہ پر بھروسہ ہے“۔

”اچھا.....کرو بھروسہ“۔ سعید نے تھپکی دی اور رخصت کر دیا...جانے کے بعد وہ کچھ سوچ میں پڑ گئے.....ثانیہ سلیم کے بیٹے کی کلاس فیلو تھی...انہیں معلوم تھا کہ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں.....اس لئے سعید نے بڑی کوشش کی کہ وہ بھی ساتھ جائے مگر وہ ان کا احسان نہیں لینا چاہتا تھا...سی ایس ایس کی تیاری میں مصروف ہو گیا اور رزلٹ جب آیا تو وہ فرسٹ پوزیشن میں ڈی ایم جی کے گریڈ میں اسسٹنٹ کمشنر لگ گیا...سعید صاحب کو قدرے خوشی بھی ہوئی...مگر زیادہ خوش نہیں ہوئے۔

شام کے وقت آسیہ کے ساتھ باغ میں بالکل آبشار کے قریب بیٹھے تھے.....باغ کے کناروں پر سرو کے درخت ہوا کے ہلکوروں سے جھوم رہے تھے۔ فضا بڑی ہی رنگین پرور اور ہوائیں میٹھی میٹھی خوشبوؤں سے راگ لاپ رہی تھیں اور ساتھ ساتھ دل اور دماغ کو تقویت دے رہی تھیں.....وہ آہستہ سے کہنے لگے۔

”آسیہ...عاصم نے بڑی اچھی پوزیشن لی ہے...اور فیوچر میں کافی آگے بڑھے گا.....ثانیہ اس کو بہت چاہتی ہے.....مگر“۔

”مگر کیا“۔

ویٹر...چائے کی ٹرالی لا رہا تھا.....سعید صاحب نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا.....جب وہ چائے بنا کر دے گیا تو بولے۔

”بولیں سعید“

”صرف ڈگری ہے اس کے پاس“

”تو اس سے کیا ہوتا ہے.....اتنی دولت آپ کے پاس ہے وہ کس کی ہے“۔

”لیکن ہے دونوں کی.....مگر دنیا کیا کہے گی“۔

”دنیا کی پرواہ نہ کریں.....بیٹی کی خوشی بہت عزیز ہے“۔ آسیہ نے آبشار سے گرتے چھینٹیں دوپٹے کے پلو سے صاف کیے.....آبشار جب تالاب پر گرتی تو آس پاس کے قمقمے جگمگاتے اور بھی بھلے لگتے.....گو ابھی اندھیرا نہیں چھایا تھا.....سارے قمقمے سر شام ہی مسلسل جگمگا رہے تھے جیسے آسمان سے چاند

ستارے اتر کر سعید صاحب کے بنگلے میں رنگ ونور کی بارش کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے.... آسیہ عاصم کی لیاقت اور اعلیٰ تعلیم سے مرعوب تھی مگر.... سعید صاحب لیاقت کے ساتھ ساتھ دولت کو بھی ترجیح دے رہے تھے۔

آسیہ اس وقت بچوں کی وجہ سے کچھ اداس ہو رہی تھی.... واٹس ایپ سے ثانیہ سے بات کرنے لگی.... جو خوش ہوتے ہوئے ماں سے کہہ رہی تھی.... ''دیکھیں ماما عاصم کتنا لائق ہے وہاں رہ کر اس نے اول پوزیشن لی ہے... پاپا ہمیشہ کہتے تھے اس نے بھی پروفیسر بننا ہے.... خیر وہ تو سول سروس میں چلا گیا... لیکن میں آن کر پروفیسر ہی بنوں گی. پاپا کے کہنے پر اعلیٰ ڈگری چھ مہینے کے بعد لے لوں گی.... اور ایان کا پتہ نہیں کہ وہ فیکٹری کو سنبھالتا ہے کہ نہیں.... اس کو پیسہ بنانے کا جنون ہے وہ خوش رہے گا''۔

''چلو خیر سے تم لوگ آؤ تو سہی پھر آسیہ نے بیٹی کی بات سعید سے بھی کروائی مگر جو کچھ اس نے کہا کہ پروفیسر بنے گی یہ سب باتیں وہ گول کر گئیں سوچنے لگی.... کئی رنگ بدلتے ہیں بچوں کی سوچ میں.... جہاں اللہ لے جائے گا وہی بہتر ہوگا''۔

وہ دونوں مختلف سوچوں میں گرے ہوئے اندر چلے گئے.... پہاڑی علاقے کی وجہ سے سرِشام ہی اندھیرا پڑ جاتا تھا۔

کئی دنوں سے مسلسل بارش ہو رہی تھی... کبھی تیز اور کبھی مدھم سی.. مگر رکنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ آسیہ نے سعید سے کہا۔
کبھی بارش ایسی مسلسل نہیں ہوئی تھی.... لیکن اب تو کئی دنوں سے مسلسل ہو رہی ہے۔

''فکر کی بات نہیں ہے... اگر لان میں پانی بھر جائے گا تو فوراً اس کا حل تلاش کروں گا۔ آسیہ پیسہ ہونا چاہیے.... زندگی میں کوئی مشکل نہیں آتی.... میں جب فیکٹری میں جاؤں گا تو ذرا بھر بھی پانی اکٹھا ہوا تو فوراً فون کر دینا.... منٹوں میں سارے کا سارا پانی نکلوا دوں گا...... پیسے میں بڑی طاقت ہے''۔

''پیسے میں اللہ سے زیادہ طاقت نہیں ہوتی.... بس یہ کہیں اللہ کرم کرے گا''۔

اب کی مرتبہ سعید صاحب نے اپنا جملہ دہرایا.... پیسہ بھی تو اللہ ہی دیتا ہے۔ لیکن پیسہ اکٹھا کرتے میں انسان کو اپنی محنت کا استعمال کرنا پڑتا ہے.... ابھی وہ دونوں بات ہی کر رہے تھے کہ ملازم بھاگتے ہوئے آیا اور بولا۔

''صاحب جی... ساتھ کے گاؤں میں سیلاب آ گیا ہے.... لوگوں کے کچے گھر مسمار ہونے لگے ہیں.... ایک گاؤں میں تو جتنے بھی کچے گھر تھے وہ سیلاب کی نظر ہو گئے ہیں''۔

سعید صاحب نے کہا۔

جب کئی دن سے بارش ہو رہی تھی تو سیلاب نے تو آنا ہی تھا... پھر کچے گھروں کی کیا حقیقت ہوتی ہے.... مسلسل بارش سے مکان تو گرتے ہی ہیں۔ مگر صاحب جی میرے بوڑھے والدین ہے.... مجھے گاؤں جانا ہوگا۔

"تم فون کر کے خیریت معلوم کر لو"۔

نہیں جی میں رک نہیں سکتا.... مجھے جانا ہو گا....وہ تیزی سے کواٹر کی جانب چلا گیا...آسیہ پریشان سی سعید کو کہنے لگی۔

نہ جانے سیلاب کی تباہ کاریاں کیا رنگ لائیں.... مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے.... کہیں یہاں پر سیلاب کا پانی نہ آ جائے۔

کیسی بدشگونی کی باتیں کرتی ہو۔ یہ گھر اتنا مضبوط ہے.... کتنا تو سریا ڈلوایا تھا..... سو سال تک یہ ہل نہیں سکتا..... پیسہ تھا تو اتنا مضبوط گھر بنوایا تھا میں نے مگر آسیہ اندر ہی اندر پریشان سی ٹی وی آن کر کے خبریں سننے لگی... سیلاب کی تباہ کاریاں ہر چینل پر سنائی جا رہی تھیں.. سعید صاحب بھی تھوڑے سے پریشان دکھائی دینے لگے.

سیلاب کی وجہ سے بہت سے غریبوں کے گھر پانی کے ریلے میں بہہ گئے۔ جن کے روزی کا ذریعہ جانور تھے وہ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے ... پانی کی سطح مسلسل بلند ہو رہی تھی۔ آسیہ نے پریشان ہوتے ہوئے سعید کی جانب دیکھا...اور کہا۔

"اپنا گھر چھوڑ کر کہاں جائیں"۔

"یہ شہر ہے... یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ ایک دو روز میں بارش بھی تھم جائے گی۔ فکر کی کوئی بات نہیں ہے"۔

"ہائے اللہ میرے بچے بھی باہر ہیں"۔

"اچھا ہے وہ وہاں محفوظ ہیں... میں کہہ تو رہا ہوں کچھ نہیں ہوگا"۔

مگر آپکا ہوٹل تو شہر سے دور ہے.... وہاں تو پانی اکٹھا ہو سکتا ہے۔

"فکر نہ کرو سب کچھ آسانی سے ہو جائے گا"۔

ابھی وہ دونوں اس موضوع پر بات کر رہے تھے کہ ہوٹل سے منیجر کا فون آ گیا....وہ بتا رہا تھا کہ پانی تیزی سے اس طرف آ رہا ہے.... ہوٹل اونچائی پر نہ ہونے کی وجہ سے پانی اکٹھا ہو رہا ہے....اور لوگ ہوٹل خالی کرتے ہوئے بھاگ رہے ہیں.... سعید صاحب کو پریشانی لاحق ہو گئی....اور منیجر سے کہنے لگے.... جتنے بھی روپے لگتے ہیں پانی کی روک تھام کرو۔ وہ پریشانی سے بولا۔ اس کے گلے سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"سر جی سیلاب اتنی تیزی سے آ رہا ہے کہ کچے گھروں کے بعد اب بڑے بڑے پکے مکان بھی اس علاقے میں محفوظ نہیں رہے... پانی کا تیز ریلہ راستے میں کچے

پکے مکان اور بڑی بڑی عمارتوں کو ریت کے گروندوں کی طرح بہا کر لے کر جا رہا ہے۔ آپ بھی جلد ہی کوئی محفوظ پناہ گاہ ڈھونڈ لیں کچھ ہو سکتا ہے.... سعید نے گھبرا کر آسیہ کو کہا.... گھر میں جو نقدی ہے وہ اور جلدی سے سارا زیور لے لو اور گاڑی میں بیٹھنے کی کرو.... لاکھ روکنے کے باوجود تمام ملازم اپنے اپنے گاؤں چلے گئے تھے... سعید نے اپنی چیک بک روپیہ اور آسیہ نے زیور اکٹھا کیا اور گاڑی میں بیٹھے ہی تھے.... کہ شور مچ گیا.... یہاں بھی پانی تیزی سے آ رہا ہے.... محفوظ جگہوں پر چلے جائیں.... سعید صاحب نے گھر کو تالا لگایا... خدا کا شکر تھا کہ ڈرائیور لاہور کا تھا ورنہ ان کو نکلنے میں دشواری ہوتی.... تیزی سے لاہور کی سمت گاڑی جا رہی تھی۔ سعید صاحب کا لاہور میں فلیٹ تھا اور ڈرائیور کو بھی لاہور ہی جانا تھا۔ دیہات زیر آب آ گئے تھے۔ مکان گر گئے تھے.... اور مکین جان بچا کر علاقہ چھوڑ رہے تھے۔ پانی کی لپیٹ میں آنے والے علاقوں کا زمینی رابطہ کٹ کر رہ گیا تھا۔ خیر پورا اور نوشہر فیروز میں بھی پانی کئی آبادیوں میں داخل ہو گیا تھا.... اور دیکھتے ہی دیکھتے سعید صاحب کا مضبوط ترین فائیو سٹار ہوٹل ریت کے گھروندے کی طرح بہہ گیا.... اور کچھ ہی فاصلے پر فیکٹری .... پانی میں ڈوبی ہوئی تھی... لوگ جان بچا کر بھاگ رہے تھے اور فیکٹری بھی ایک زوردار ریلے میں بہہ گئی۔ تب تک سعید صاحب اسلام آباد کراس کر کے بھیرے کے قریب تھے.... آسیہ کی آنکھوں میں آنسو موسلا دھار بارش کی طرح بہہ رہے تھے.... بڑی مشکلوں سے لاہور پہنچے... دیکھتے ہی دیکھتے سعید صاحب عرش سے سے فرش پر آ گئے تھے.... مختصر سامان گاڑی سے نکالا.... فلیٹ میں ہر شے موجود تھی.... لیکن.... وہ سب کچھ نہیں تھا جو پیسے سے خرید سکتے.. آسیہ کی مسلسل دعائیں تھی جو دونوں بچ بچا کر لاہور پہنچ گئے تھے.... بچوں کے فون پر فون آ رہے تھے.... اور وہ دونوں فلائٹ پکڑ کر لاہور پہنچ گئے تھے.... سعید صاحب نے ٹی وی پر ہوٹل پانی کی نظر ہوتے دیکھا... تو وہ گم سم بیٹھے تھے اور اللہ سے گڑگڑا کر توبہ کر رہے تھے.... جس پیسے کا ہر وقت دم بھرتے تھے.... وہ ان کی فیکٹری اور ہوٹل کو نہ بچا سکا۔

ثانیہ نے کہا۔

"پاپا فکر نہ کریں.... آپ کے بچے... آپ کا سہارا بنیں گے".... وہ باپ سے لپٹ گئی اور ایان پریشان سا بیٹھا تھا... کئی منصوبے اعلیٰ بزنس کے لیے بنا چکا تھا مگر قسمت کو شاید یہی منظور تھا۔

سارے دوست تو وہیں پہاڑی علاقے میں رہ گئے....صرف سلیم لاہور میں رہائش اختیار کئے ہوئے تھا....جو گاہے بگاہے.... سعید کے بلانے پر پہاری علاقے میں آتا تھا پرانا کلاس فیلو تھا....پھر ثانیہ کے ساتھ عاصم بھی پڑھتا تھا....ایک لحاظ سے....سلیم کو ثانیہ بہت پسند تھی....سلیم اور عاصم کو جب معلوم ہوا کہ سعید اور آسیہ بچ بچا کر لاہور آ گئے ہیں تو وہ عاصم اور رضیہ کے ساتھ ان کے فلیٹ پر آئے...دونوں بچوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔

سلیم نے آگے بڑھ کر کہا۔

"تمہیں بہت بہت مبارک دیتا ہوں کہ اللہ نے تمہاری جان کی حفاظت کی ہے....روپیہ تو آنی جانی چیز ہے...محنتی ہو....بہت روپیہ بنا لو گے....زندگی ہے تو سمجھ لو سب کچھ اللہ کے فضل سے تمہارے پاس ہے۔ غم نہ کرو...اچھے دنوں کے بعد آزمائش آئی ہے بہت جلد ختم ہو جائے گی...پھر"۔

"بس...بس سلیم....اب میرے میں اتنی ہمت نہیں کہ ویسا کاروبار کر سکوں....سب کچھ چلا گیا اللہ کی نافرمانی سے"۔

"کہاں گیا ہے؟"

"یہ دو...چاند تمہارے پاس ہیں. اگر فلیٹ میں تمہارا دم گھٹتا ہے تو میں نے ڈیفنس میں بہت بڑا گھر بنایا ہے...سب عاصم کی محنت ہے...یہ آجکل لاہور کا ڈی سی لگا ہوا ہے....بہت عمدہ گھر بنایا ہے اس کے کئی پورشن ہیں...دونوں دوست اکٹھے رہیں گے...اور بچے...بھی۔ ثانیہ بیٹی آ گئی ہے....اس کو میں اپنی یونیورسٹی میں جاب دلوا رہا ہوں....میں ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ ہوں...اور ایان جہاں چاہے گا. عاصم اس کے لیے کوشش کرے گا۔ اچھی جاب دلوانے کی"۔

سعید کی آنکھوں میں آنسو اتر آئے....تو دھیرے سے گویا ہوئے وہ بولے۔

"ساری عمر میں سوچتا تھا کہ دولت میں بڑی طاقت ہے...مگر اس آزمائش نے مجھے بتایا کہ سچی دوستی اور محبت میں طاقت ہے...سلیم نے جواب دیا۔

"ثانیہ...میری بہو ہے....اور مجھے اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز ہے"۔ سلیم نے ثانیہ کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

قریب بیٹھے ہوئے عاصم کو یوں لگا جیسے ویرانے میں بہار آ گئی ہو....جو فضا اس وقت بوجھل بوجھل تھی۔ وہاں میٹھی میٹھی خنک ہواؤں نے....خوشی کے راگ سنانے شروع کر دیئے....دونوں مسرور سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

☆☆☆☆☆

بلیڈ

نذیر احمد کی موٹر سائیکلوں کی ورکشاپ تھی۔ پچھلے بیس سال سے وہ اس کاروبار سے وابستہ تھا۔ شروع میں اس نے بھی ایک استاد کی دوکان پر شاگردی اختیار کی تھی اس وقت اس کی عمر سولہ برس تھی۔ اس کا باپ تو اسے اس سے بھی کم عمر میں دکان پر چھوڑ آتا، لیکن کم عمری میں ہی آوارہ دوستوں کی صحبت اور فلموں کے شوق نے اسے نذیر سے جیرا بنا دیا تھا۔ اس کے اکثر دوست تو اسے جیرا بلیڈ کہتے تھے۔ وہ خود بھی اس نام پر خوش تھا اور کئی مرتبہ منور ظریف کی فلم جیرا بلیڈ دیکھ چکا تھا۔ منور ظریف ایک لازوال اور بے مثال فنکار تھے، جنھیں کئی لوگ فلمی دنیا کا غالب کہتے ہیں۔ وہ آج بھی غالب ہیں۔ منور ظریف کو دنیا سے گئے برسوں بیت گئے مگر ان کے فن کو زوال نہیں آیا۔ ان کی فلمیں آج بھی شوق سے دیکھی جاتی ہیں۔ جیرا بھی منور ظریف کی فلمیں دیکھتا اور اس عظیم فنکار کی نقالی بھی کرتا تھا۔ اب جب کہ جیرے کے ذاتی کاروبار کو بیس برس گزر چکے تھے اور اس کی عمر بھی چالیس سال سے زائد ہو چکی تھی، اس نے اپنے کاروبار کو وسعت دینے کی کوشش کی۔ اب وہ ایک میکینک کے علاوہ موٹر سائیکلوں کا کاروبار بھی کرنے لگا تھا۔ یہ چوری کی موٹر سائیکلیں اسے مختلف ذرائع سے ملتی تھیں۔ دکان پر کام کرنے والے دو لڑکے وسیم اور ساجد اس کے رازدار تھے۔ موٹر سائیکلیں استاد ناصر اور اس کے ساتھی لاتے تھے۔ یہ دوسرے شہریوں سے چوری ہو کر آتی تھیں۔ نمبر پلیٹس بدلی جاتی تھیں۔ کاغذات بھی بن جاتے تھے۔ مہنگائی کے اس دور میں ڈیڑھ لاکھ والی موٹر سائیکل تیس چالیس ہزار میں بکتی تھی۔ غریب عوام کو اور کیا چاہیے تھا۔ جیرا اب واقعی جیرا بلیڈ بن چکا تھا۔ ایک ایسا بلیڈ جو لوگوں کی جیبیں کاٹ رہا تھا۔ اس کی شادی تو والدین اپنی زندگی میں ہی کر گئے تھے۔ اب نذیر عرف جیرا دو بچوں کا باپ تھا۔ اس کی بیوی ساجدہ ایک نیک خاتون تھی۔ اسے یہ خبر ہی نہ تھی کہ اس کا خاوند کس طرح دو نمبری سے پیسے کما رہا ہے۔ وہ تو صوم و صلوٰۃ کی پابند ایک سادہ اور دنیاوی لحاظ سے ایک ان پڑھ عورت تھی۔ نذیر کے دونوں بچے شعیب اور خالدہ مختلف سکولوں میں پڑھتے تھے۔ نذیر خود نہیں پڑھا تھا، مگر بچوں کو پڑھانا

محمد نوید مرزا

چاہتا تھا۔ لیکن اسے حرام حلال کی تمیز نہ تھی۔ ویسے بھی وہ اس معاشرے کا حصہ تھا، جہاں ہر دوسرا شخص ایک بلیڈ بن چکا ہے اور اسی بلیڈ سے دوسرے کو کاٹ رہا ہے۔ جیرا بھی ہر طرح کے انجام سے بے خبر روپیہ چھاپنے کی مشین بن چکا تھا۔ ایک دو بار اس کے دوکان پر چھاپے بھی پڑے، پولیس بھی آئی، لیکن نہ جانے کیا ہوا، اس کو کوئی پکڑ نہیں سکا۔ کبھی شک کا فائدہ اٹھا کر، کبھی بلیڈ چلا کر اور کبھی پیسے کے زور پر وہ بچ جاتا تھا۔ اب اس نے اپنا پرانا مکان بیچ کر نیا عالیشان گھر خرید لیا تھا۔ ایک گاڑی بھی اس کے پاس تھی۔ اب وہ موٹر سائیکلوں کے کاروبار کے علاوہ گاڑیوں کے کاروبار کے متعلق بھی سوچ رہا تھا۔ زندگی بہت تیزی سے گزر رہی تھی۔ نذیر کے بچے پرائمری سکول سے ہائی سکول اور پھر کالجوں میں پہنچ گئے۔ نذیر اب خوشحال زندگی گذار رہا تھا۔ مگر وہ ناجائز ذرائع سے اکٹھی کی ہوئی رقم کو ہی اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی سمجھتا تھا۔ مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہ جس بلیڈ سے لوگوں کی جیبیں کاٹ رہا ہے وہ اس پر بھی چل سکتا ہے۔

ایک دن اس کے دونوں بچے اپنی گاڑی میں کالج سے واپس آ رہے تھے۔ ڈرائیور بڑی مہارت سے گاڑی چلا رہا تھا۔ مگر دوسری جانب سے آنے والے ہیوی لوڈر ٹرک نے انھیں سڑک سے گذرتے ہوئے نہیں دیکھا اور گاڑی کو بری طرح کچل دیا۔ جس کے نتیجے میں ڈرائیور موقع پر ہی ہلاک ہو گیا اور دونوں بچے شدید زخمی ہو گئے۔ انھیں ہسپتال پہنچایا گیا مگر بر وقت خون کی فراہمی نہ ہونے پر بیٹا جانبر نہ ہو سکا جب کہ بیٹی آئی سی یو میں منتقل کر دی گئی۔ نذیر کو اطلاع ملی تو وہ چیختا ہوا اپنی بیوی کے ساتھ ہسپتال پہنچا۔ بیٹے کی لاش دیکھ کر بیوی دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ نذیر نے بیٹی کے لیے فوری طور پر خون کا بندوبست کیا۔ بیٹی کی جان بچ گئی مگر جوان بیٹے کی موت نے نذیر اور اس کی بیوی کو تو پاگل ہی کر دیا۔ نذیر دیوانوں کی طرح ڈاکٹروں اور ہسپتال کے عملے پر چیخنے لگا۔ لیکن نذیر عرف جیرا بلیڈ یہ نہیں جانتا تھا کہ اس سارے سسٹم کو زنگ لگ چکا ہے۔ اب وہ اکیلا نہیں، کئی جیرے اپنے ہاتھوں میں بلیڈ لئے بیٹھے ہیں۔ اس معاشرے میں ایک نہیں ہزاروں لوگ اپنے اپنے ہاتھوں میں بلیڈ لے کر بیٹھے ہیں اور ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ رہے ہیں۔

نذیر احمد اپنی زخمی بیٹی کو ہسپتال میں چھوڑ کر جب ایمبولینس میں بیٹے کی لاش لے کر اپنی عالیشان کوٹھی میں پہنچا تو پورے محلے میں کہرام مچ گیا۔ لوگ جوق در جوق اس کے ساتھ افسوس کرنے آتے رہے۔ ان میں سستی موٹر سائیکلیں حاصل کرنے والے محلے دار بھی تھے۔ نذیر احمد کے کارندے بھی تھے، جو آج اس حادثے کے بعد نذیر احمد سے گلے مل کر پھوٹ پھوٹ رو بھی رہے تھے اور آئندہ کے لیے اس کاروبار سے توبہ بھی کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ نذیر بھائی جو بلیڈ ہم دوسروں پر چلاتے تھے، آج ہم پر چل گیا ہے۔

☆☆☆☆☆

خزانہ

رونو وا تاریخ سے گہری دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ اپنے علاقے کی ہر پرانی عمارت کو دیکھ چکا تھا۔ وہ ان پرانی سوچ اور رہن سہن والے لوگوں سے گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ اس کی بھوری آنکھیں ایسے لوگوں کے چہروں کی سلوٹوں میں چھپے زمانے دیکھ لیتیں اور زبان سے پرانے ذائقوں کو محسوس کر لیتا تھا۔ پرانی عمارات دیکھنے، تہذیبوں کا مطالعہ کرنے کا اسے جنون کی حد تک شوق تھا۔

کبھی کبھار وہ اس شوق میں اتنا غرق ہو جاتا کہ خود کو کسی معدوم تہذیب کا کوئی کردار سمجھ لیتا۔ اس کا گھر ایک پہاڑی علاقے میں تھا۔ جو شہر کی زندگی سے ذرا کٹا ہوا تھا۔ جلد ہی شام ہو جاتی اور ایسے ہی سورج بھی جلد ہی بیدار ہو جاتا۔ یہ تنومند، مضبوط قد و کاٹھ کا ایک اٹھارہ سالہ لڑکا تھا۔ جس کی مجموعی شخصیت کے ساتھ ہنسی ایک عجیب تازگی لیے ہوئے تھی۔ گہرے بھورے گھنگھریالے بال الجھے ہی رہتے۔ خوش مزاجی اس کی طبیعت کا خاص عنصر تھی۔

مصروف رہنے والا یہ لڑکا بوقت ضرورت ہر کسی کی مدد کر دیا کرتا۔

اسی گاؤں میں ایک دو منزلہ لکڑی کا پرانا گھر تھا جس میں ایک چالیس سالہ حسین بیوہ اپنے دس سالہ بیٹے کے ساتھ رہتی تھی جو مقامی سکول میں پڑھاتی تھی اور شام میں کچھ بچوں کو گھر پر موسیقی کی تعلیم دیتی۔ وہ ہمیشہ سیاہ فل سکرٹ کے اوپر گہری سلیٹی شرٹ اور سر پر سفید رومال باندھے نظر آتی۔ نیلی آنکھیں۔ کھڑے کھڑے نقش و نگار سفید رنگت والی یہ خاتون بلاشبہ جوانی میں قیامت ڈھاتی ہوگی۔ مگر اب دونوں ابروؤں کے درمیان گہری لائن چہرے پر غصے یا ناگواری کا احساس دلاتی تھی شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ اس سے بے تکلف ہوتے ہوئے ڈرتے تھے۔

رونو وا نے سن رکھا تھا کہ اس گھر کے لاونج میں رکھی میز کے نیچے ایک لکڑی کا بڑا سا ٹکڑا فرش کے اندر نصب ہے۔ اور مشہور ہے کہ اس کے نیچے خزانہ دفن ہے اس لیے یہ بیوہ کسی سے زیادہ گھلتی ملتی نہیں حتیٰ کہ موت کی آخری رسومات میں بھی کم ہی شامل ہوتی ہے۔ کبھی کبھی علاقے کی سمٹری میں نظر آتی ہے خاوند کی قبر پر جاتی ہے۔ قبر کو دھوتی ہے۔ پھول

صائمہ ناصر

رکھتی ہے۔ کچھ وقت گزار کر اپنی پرانی چھوٹی سی کار میں واپس آجاتی ہے۔

اس کا دس سالہ بیٹا بہت خوبصورت بچہ ہے عمر سے بڑا قد، توانا جسم، سیاہ گھنگھریالے بال، سرخ و سفید چہرہ اور نیلی کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری آنکھیں۔ کسی روبوٹ کی مانند ماں کے ساتھ ساتھ رہتا۔

رونووا نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس بچے سے دوستی کی جائے تاکہ اس کا یہ خوبصورت گھر اندر سے دیکھ سکے مگر اس لڑکے نے تو بات نہ کرنے کی قسم اٹھا رکھی ہے۔ رونووا نے بھی کسی نہ کسی طریقے نہ صرف گھر دیکھنے کی ٹھانی ہوئی تھی بل کہ خزانے والی لکڑی کا سراغ لگانے کا بھی عہد کیا ہوا تھا۔

وہ باقاعدگی سے اور غیر محسوس طریقے سے دونوں ماں بیٹے کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اسے اس بات پر حیرت تھی کہ یہ لوگ نہ تو کسی کے ہاں دعوت پر جاتے ہیں اور نہ ہی کوئی ان کے گھر آتا جاتا دکھائی دیتا سوائے موسیقی کی تربیت لینے والے چار پانچ بچوں کے جو لگ بھگ اس کے بیٹے کی عمر کے ہیں۔ نہ تو وہ کبھی اتوار کو چرچ ہی جاتی ہے نہ ہی کوئی فرائیڈے کی مصروفیت ہے۔ عجیب عورت ہے۔

خیر اسے ان تمام باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

ایک دن وہ حسب معمول اس کے گھر کے قریب سے گزرا تو دروازے پر ایک چٹ آویزاں تھی

"ہارن مت بجائیں اندر مریض ہے۔ شکریہ"

رونووا کو دکھ سا محسوس ہوا۔ مگر اگلے ہی لمحے شیطان نے اسے بہکایا کہ یہ بہترین موقع ہے گھر دیکھنے اور خزانے کے بارے معلومات حاصل کرنے کا۔ کیوں نہ عیادت کی نیت سے جایا جائے اور پستول کے زور پر سارا گھر بھی دیکھے اور لکڑی کے ٹکڑے کو اکھاڑ کر خزانے کا کھوج لگایا جائے۔

بہترین منصوبہ بندی کے تحت اس نے اگلی شام کا پروگرام بنایا۔ اپنے والدین کے کمرے کی پرانی الماری سے اپنے پڑدادا کی قریباً اسی سال پرانی پستول نکالی جو چلتی نہیں تھی۔ پینٹ میں اڑیسی اور گھر میں دو دن اپنے دوست کے ہاں قریبی گاؤں جانے کا کہہ کر مغرب سے پہلے نکل آیا۔ قریبی باغ سے اس نے کچھ تازہ پھول اور پتوں کے ساتھ ٹہنیاں توڑیں انھیں گل دستے کی شکل دی اور خاتون کے گھر جانے والے راستے پر نکل آیا۔

سردیوں کی یخ بستہ رات میں سڑک ویران پڑی تھی ویسے بھی ان یخ راتوں میں آتش دان کے قریب ہی لوگ براجمان ہوتے ہیں لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اس گھر کی جانب بڑھنے لگا۔ جونہی اس گلی میں مڑا سامنے وہ پرانا گھر پورے جاہ جلال کے ساتھ موجود تھا۔ رونووا نے ڈرتے ڈرتے بیل بجائی۔ تیسری بیل پر بچہ باہر آیا۔ رونووا نے آنے کا مقصد بیان کیا۔ بچے نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا اور اسے

اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔ لاونج میں رکھے پرانی طرز کے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے کمرے کے اندر چلا گیا۔

قدیم طرز کا گھر، قدیم فرنیچر جس کا ہلکا سنز روغن جگہ جگہ سے آکھڑا ہوا تھا۔ صوفے کے ساتھ لکڑی کی گول میز کے اوپر کانچ کے جگ گلاس جو پرانے ڈیزائن کے تھے کروشیے کے کور سے ڈھکے ہوئے تھے ہلکے گلابی پھولوں والے کریم کلر کے پردے۔ آتش دان کے کارنس پر سفید پھول دان میں ہلکے رنگوں کے مصنوعی پھول بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ گھر کا مجموعی ماحول خوابیدہ اور رومانوی سا لگ رہا تھا جبکہ مکین بہت خشک مزاج اور سپاٹ چہروں والے تھے۔

ایک دیوار پر مونالیزا کی آئل پینٹ سے بنی پینٹنگ اور سامنے والی دیوار پر حضرت مریم کی گود میں یسوع مسیح کی دل کش پینٹنگز ٹنگی ہوئیں تھیں۔ لاونج سے زرا آگے کی طرف چار کرسیوں اور گول میز والا ڈائننگ ٹیبل پڑا تھا جس کے اوپر بڑا گل دان اور سلیقے سے رکھی گئی جام، سوسز، چمچ، کانٹے، سوپ باؤل، پلیٹس اور گلاس سجے تھے گویا ڈنر تیار تھا۔

رونووا کے ذہن سے سب غلط خیال ڈگمگانے لگے اور ماحول میں پھیلی خوبصورتی اور دلکشی نے اس کا دل گداز کر دیا۔

بچہ کمرے سے باہر آیا اور نہایت شائستہ زبان میں اسے اندر آنے کا کہا۔

وہ جھٹ سے اٹھا گل دستہ اٹھایا اور بچے کے پیچھے کمرے کی طرف بڑھا۔ بچے نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اب کمرے کے اندر تھا۔ سامنے پرانی طرز کے پلنگ پر جس کی ٹیک پر آئینہ لگا ہوا تھا۔ کروشیے سے بنی سفید چادر اور نیلے پھولوں والے تکیے سے ٹیک لگائے۔ سفید لحاف اوڑھے خاتون لیٹنے کے انداز میں بیٹھی تھی۔ آنکھوں سے طبیعت کی ناسازی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ رونووا نے آگے بڑھ کر ہاتھ پر بوسہ دیا اور گل دستہ پیش کیا۔ خاتون ہلکا سا مسکرائی وہ واقعی بہت حسین تھی۔

رونووا نے کمرے کا جائزہ لیا۔ پرانی طرز کی دو کرسیاں آتش دان کے ارد گرد پڑی تھیں۔ پلنگ کے ساتھ لکڑی کا چھوٹا میز جس پر کچھ دواؤں کے ساتھ پانی کا گلاس پڑا تھا ساتھ ہی ایک سفید باول میں شاید سوپ تھا۔ ایک نفیس رومال پڑا تھا۔ مریض کا کمرہ ہونے کے باوجود بھینی بھینی خوشبو پھیلی تھی۔

خاتون نے رسمی تعارف کے بعد بچے کو اشارہ کیا۔ وہ فوراً باہر نکل گیا جب واپس آیا تو گول پھولوں والی ٹرے میں گرم گرم کریم کافی اور تین خستہ بسکٹ ایک چھوٹی چوکور پلیٹ میں رکھ کر سلیقے سے ساتھ پڑی میز پر لا کر رکھ دیے۔ خاتون نے کافی لینے کا اشارہ کیا۔

رونووا نے بہت شکریے کے ساتھ کافی پی یہ واقعی ماہرانہ انداز سے تیار کی گئی کافی تھی

"جیک بہت عمدہ کافی بناتا ہے" خاتون نے مسکراتے ہوئے کہا

"جی یہ عمدہ کافی ہے"

"اب میں بہت بہتر ہوں، احتیاط آرام کر رہی ہوں، کل تمہیں ایک عمدہ ناشتے کی ٹیبل پر خوش آمدید کریں گے" خاتون نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"جی میں شکر گزار ہوں۔ میں اس عالی شان گھر دیکھنے کا متمنی ہوں" رونووا نے مدعا پہ آتے ہوئے کہا

"جیک یہ بھولت دے گا۔"

"جی تشریف لائیے" جیک نے مسکرا کر سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا:

اسے امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس کی خواہش پوری ہو جائے گی

وہ دونوں کمرے سے نکل آئے۔

"یہ گھر اپنی مثال آپ ہے۔ اس پوری وادی میں اس سے عالی شان گھر دوسرا نہیں" رونووا نے کہا:

بچے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے گھر کا ایک ایک کونہ دیکھا۔ مگر خزانے والی جگہ بڑے میز کے لمبے کور کی وجہ سے نہ دیکھ سکا۔ زیادہ تر تعمیر لکڑی سے ہوئی تھی۔ جہاں کہیں ضرورت محسوس ہوئی تو سرخ چھوٹی اینٹوں کا مہارت سے استعمال کیا گیا تھا۔

بالائی منزل پر بہت ٹھنڈ تھی وہ جلد ہی نیچے لاونج میں آ گئے۔

بچہ اسے دوبارہ خاتون کے کمرے میں لے لیے آیا۔

"اب اجازت چاہوں گا مادام"

آج رک جاتے تو ہمیں اچھا لگتا۔ تم ایک دلچسپ نوجوان ہو"

"مجھے رات قیام کرنے میں کوئی امر مانع نہیں"

اس نے خوش دلی سے کہا۔ اس سے بہتر موقع شاید پھر نہ ملے خزانہ ڈھونڈنے کا۔۔ اس نے دل میں سوچا۔

خاتون اپنی آپ بیتی سنا کر سو گئی۔

جیک اور رونووا تمام رات باتیں کرتے رہے جیک نے اعلیٰ قسم کی شراب اسے پینے کو دی۔ کچھ ہی دیر میں اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور وہ بولتے بولتے۔ صبح کے قریب سو گئے۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو یہ ایک چمکدار صبح تھی۔ وہ اٹھ کر باہر آیا تو خاتون جس کا نام اولہ تھا وہ سلیقے سے تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر پر تکلف ناشتہ سجائے اس کی منتظر تھی۔

"صبح بخیر یسوع کے مہمان" خاتون نے پروقار انداز میں اسے کہا۔ بچے نے بھی سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا سا جھک کر اسے صبح بخیر کہا۔

"صبح بخیر" خوبصورت لوگو!

رونووا نے مسکرا کر کہا اور ٹیبل پر ان کے ساتھ ناشتے میں شریک ہو گیا۔

ناشتہ مکمل کرنے کے بعد وہ پھر لاونج میں آ گئے۔ خاتون نے موسیقی کے بارے میں سیر حاصل گفتگو کی جسے سن کر رونووا حیران رہ گیا۔

"آپ یقیناً عمدہ موسیقار ہیں۔ تو گاتی بھی اچھا ہوں گی۔ بے حد شیریں گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے"

"بجاتی اچھا ہوں۔ مگر گاتا جیک بہت عمدہ ہے"

"تو پھر جیک سے گزارش ہے"
اولہ نے پیانو بجایا اور جیک نے como fue بنی مورے کا گیت گایا۔اور بے مثال گایا۔
"آپ دونوں خدا کے تحفے ہیں اس زمین خصوصا اس پہاڑی پر"
" اور آپ ہمارے مہمان -دل چسپ نوجوان"
دن بھر اس کی کوشش تھی کہ لاونج میں رکھی میز کا لمبا ٹیبل کور کسی طرح اٹھا کے لکڑی کا ٹکڑا دیکھے جس کے نیچے خزانہ ہے۔ مگر پورا دن اسے موقع نہ ملا اور اسے ہمت بھی نہ ہوئی کہ خزانے کی بابت پوچھے نا ہی خاتون اور بچے نے ایسا کوئی ذکر کیا۔
شام سے ذرا پہلے وہ سامنے پہاڑی کی طرف پیدل روانہ ہوئے - ٹھنڈا موسم دل چسپ موضوعات کافی کے کپ نے شام کو یادگار بنا دیا۔خاتون جتنی صاحب علم تھی بچہ بھی اسی قدر ذہین اور معلومات رکھتا تھا --رات ہونے سے پہلے وہ واپس گھر کی طرف روانہ ہو گئے--
گھر پہنچ کر خاتون نے پر تکلف ڈنر تیار کیا جس میں گرل مچھلی ،سوپ اور عمدہ شراب شامل تھی۔رات کے کھانے پر فلسفے پر گفتگو رہی--
کھانے کے بعد اولہ نے کیوبن رقص کیا جس میں جیک نے اس کی مدد کی بعد میں رونووا نے بھی ساتھ دیا۔رونووا نے خاتون کو غور سے دیکھا وہ بھر پور انداز سے ہنس رہی تھی۔خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔
اچانک اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے تو اس نے رقص ختم کر دیا۔
آخر تھک کر اولہ سونے چلی گئی۔
جیک نے رونووا کو اور شراب پلائی اور کچھ ہی دیر میں وہ بستر پر گر گیا۔
صبح پیانو کی دل فریب آواز پر اس کی آنکھ کھلی تو دن کے گیارہ بج رہے تھے۔
تینوں نے مل کر ناشتہ کیا۔اب تک اولہ، جیک اور رونووا اچھے اور بے تکلف دوست بن چکے تھے۔
"اب میں اجازت چاہوں گا" رونووا نے کہا
"ہم پھر ملنے کی امید کر سکتے ہیں؟" جیک نے کہا
" ہم اب ملتے رہیں گے" اولہ نے چہکتے ہوئے کہا
"بلکل یہ ایسے ہی ہے جیسے بہار میں پھول کھلتے ہیں۔سیا سامنے پہاڑی پر برف پڑتی ہے" رونووا نے کہا اور بڑھ کے جیک کو گلے سے لگایا
اولہ کو جھک کر سلام کیا
دونوں اسے باہر چھوڑنے آئے
"ہم پھر ملیں گے" رونووا نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا
" ہم مل کر خزانہ بھی ڈھونڈیں گے --جو حقیقت میں نہیں ہے-- ہاہاہا اور اس بار پستول بھی چلنے والا لانا، زنگ آلود نہ ہو" اولہ نے ہنستے ہوئے کہا
"محبت بڑا خزانہ ہے۔جو بغیر پستول کے مل گیا، اور اسے زنگ بھی نہیں لگتا۔بشرطیکہ پڑ دادا کا نہ ہو" ہاہاہا رونووا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا--

☆☆☆☆☆

لنگڑی چڑیا

وہ اپنے گھر کے برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھا خلا میں جانے کیا تک رہا تھا۔ کبھی وہ ماضی کے سہانے اور ہرے بھرے باغوں میں ٹہلنے لگ جاتا کبھی حال کے جنگل میں خیال کے گھوڑے پر سوار تیزی سے دوڑنے لگتا۔ ایک دم اُس کی نظر ایک چڑیا پر پڑی۔ اگر عام سی چڑیا ہوتی تو وہ آنکھ جھپک کر پھر سے خیالوں کے پاتال میں اتر جاتا۔ وہ گھروں میں رہنے والی عام چڑیوں سے کچھ الگ دکھتی تھی۔ وہ ایک لنگڑی چڑیا تھی۔ اُس کے پروں پر موٹے موٹے نیلے دھبے تھے۔ اُس کی چال اور نیلے دھبے پکار پکار کر کہتے تھے ہم کسی شرارتی چڑے کی حرکتوں کا نتیجہ ہیں۔

چڑیا اُس کے کشادہ صحن میں اپنی ایک ٹانگ سے اِدھر اُدھر ٹپتی پھر رہی تھی۔ شاید وہ پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے خوراک کا جتن کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ اڑ گئی۔ اُس نے سگریٹ کی ڈبی سے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا اور اسے ماچس دکھائی پھر وہ بڑے سکون سے سگریٹ کے دھوئیں سے چھلّے بنانے لگا۔ چھلّے کچھ دیر فضا میں گھومتے پھر یوں غائب ہو جاتے کہ وہ کبھی بنے ہی نہ تھے۔ اُن کی جگہ لینے کے لیے نئے چھلّے پھرتی سے اٹھتے اور غائب ہو جاتے۔ کچھ دیر بعد چڑیا واپس آئی۔ اُس کی چونچ میں کوئی چیز تھی۔ وہ بڑے غور سے چڑیا کو دیکھنے لگا۔ چڑیا برآمدے کے ایک منڈیر پر جا کر رک گئی۔ تین چار چھوٹے چھوٹے چڑیا کے بچے چوں چوں کرتے اپنی گردن کو گھونسلے سے باہر نکالنے لگے۔ چڑیا بڑے پیار سے انھیں چوگا دیتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں ماں کی ممتا جھلک رہی تھی۔ وہ بڑے غور سے چڑیا اور اس کے بچوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں خیال آیا اور اُس نے اپنے نوکر کو کچھ چاول صحن میں بکھیرنے کے لیے کہا تا کہ بچاری لنگڑی چڑیا کو چوگے کے لیے دور نہ جانا پڑے۔ چڑیا نے اُس کے بکھیرے چاولوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور دانے کے لیے گھر سے باہر چل پڑی۔ شاید چڑیا نے اُس کے بکھیرے

شفیع ہمدم
مترجم: ابنِ حسین شعیب الرحمٰن

چاولوں کو بھیک سمجھا اور اس کی خودداری نے یہ ذلت برداشت نہ کی۔

کچھ دیر بعد چڑیا پلٹ آئی۔ اس کی چونچ میں کوئی چیز تھی۔ اتنے میں اس کے بچے پھر چیں چیں کرنے لگے تو چڑیا انھیں چوگا دینے لگی۔

اُس نے نوکر سے رکشہ لانے کو کہا کیوں کہ آج اسے بینک سے پنشن لینے جانا تھا۔ وہ پنشن لینے کے بعد کافی دیر سڑک پر رکشہ دیکھتا رہا۔ اُس کے سامنے کئی رکشے گزرے اس نے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اندھیری طوفان کے مانند اس کے پاس سے گزر جاتے۔ وہ سڑک پر پریشان کھڑا رنگ برنگی اور طرح طرح کی گاڑیوں کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک ایک ہٹی کٹی ادھیڑ عمر عورت نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔

"میں ایک بیوہ ہوں۔ میرا شوہر ایک حادثے میں فوت ہو گیا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ سچے رب کے نام پر میری کچھ مدد کرو۔ رب آپ کو اس کا اجر ضرور دے گا۔"

اس عورت کی آنکھوں میں زندگی کی چمک اور گالوں پر لالی تھی۔ اُس کے دماغ میں لنگڑی چڑیا گھومنے لگی۔ وہ چڑیا بھی اس کی طرح ہے کیوں کہ اس کا چڑا کبھی اس کے ساتھ نہیں دکھا۔ اُس کے بھی تو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جن کا پیٹ بھرنے کے لیے اس کو بڑی دشواری سہنی پڑتی ہیں لیکن اس نے میرے بکھیرے چاولوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ جی ہی جی میں اس عورت اور لنگڑی چڑیا کا موازنہ کرنے لگا۔

جب وہ گھر پہنچا تو اس کی نظریں خود بہ خود چڑیا کے منڈیر کی طرف اٹھ گئیں۔ گھونسلے سے ابھی تک چیں چیں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اب اس کا معمول بن گیا، پڑھتے یا کوئی کام کرتے وہ چڑیا کو ضرور دیکھ لیتا۔ چڑیا اپنے کاموں میں مستغرق نظر آتی۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پر ٹپ ٹپ کے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی رہی۔

کچھ دنوں میں چڑیا کے بچے چیں چیں کرتے گھونسلے سے نکل آئے۔ ان کا جسم ابھی کمزور اور پَر بہت چھوٹے تھے۔ وہ پَر پھیلاتے اپنی ماں کے پیچھے دوڑتے۔ چڑیا ان کو چوگا دیتی رہتی تھی۔ جب چڑیا کسی بچے کو چوگا دیتی تو اس کی آنکھوں سے پیار کے جھرنے کے ماحول میں چمک جاتے تھے ان کا انگ انگ ایسے ہو جاتا کہ جیسے بچھڑے دوستوں کی آہ زاریاں ایک ہو جائیں۔ چڑیا کے بچے جب خطرے کی دھمک محسوس کرتے تو ننھے پروں سے کسی اونچی جگہ پر جا بیٹھتے۔ وہ چڑیا اور اس کے بچوں کی حرکتیں بڑے غور سے دیکھتا رہتا کبھی کبھی انھیں دیکھ کر گہری سوچوں میں گم ہو جاتا۔

ایک دن چڑیا اکیلی غمگین دیوار پر بیٹھی تھی اس کی نظریں خلا میں جانے کیا ڈھونڈ رہی تھیں۔ چڑیا کو دیکھ کر اسے ایسا لگا کہ اس کی اور چڑیا کی تنہائی میں کوئی فرق نہیں۔

☆☆☆☆☆

”اُسترا“

آج موسم خوش گوار تھا، چنانچہ علی الصبح ایک خالی سڑک پر سیر گشت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ تھوڑے فاصلے پر سڑک کنارے ہی ایک حجام کی دکان کھلی تھی۔ سوچا، لگے ہاتھوں خط بنوا لوں۔ کرسی پر بیٹھتے ہی حجام کو زلف تراشی کی فرمائشی وضع بتائی اور وہ ہنگامی بنیادوں پر پراجیکٹ مکمل کرنے کے لیے میدان میں کود پڑا۔

اس نے اپنا کام شروع کرتے ہی کلام کا آغاز کچھ یوں کیا ”جناب میں مونچھیں تو ڈیزائن دار بنا دیتا ہوں مگر داڑھی نہیں، نوجوان جب فینسی داڑھی کی فرمائش کرتے ہیں تو میں انھیں کان سے پکڑ کر روڈ کے ”پرلے پاسے“ چھوڑ آتا ہوں“

فضا میں استرا لہراتے ہوئے، جب اس نے یہ بات بتائی تو میں ضرورت سے زیادہ محتاط ہو گیا، کہ کہیں مجھے بھی عین وسطِ حجامت میں ہی نکال باہر نہ کر دے۔

خیر! حجام نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ”عالم اسلام اور پاکستان کی پسماندگی اور زوال کی وجہ تو جوانوں کے یہی ”فیشن“ ہیں“

میں نے کہا ”مگر اب تو پاکستان کا امیج عالمی سطح پر ”کڑا رے جوگا“ ہو گیا ہے“

کہنے لگا ”جناب یہ ایویں تھوڑی ہو گیا ہے، پچھلے ماہ سے ہم سب حجاموں نے فینسی داڑھی نہ بنانے کا ایکا کیا ہے“ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو میری طرف سے آشیر باد پاتے ہی اس محقق نے مزید حقائق سے پردہ اٹھانے کی ٹھان لی۔

وہ ملکی اور قومی مسائل پر اس انہماک سے گفتگو کر رہا تھا کہ بار بار اس کی توجہ حجامت سے ”آسے پاسے“ ہو جاتی۔ ایک بار تو بوتل سے اس زاویے سے فوارہ مارا کہ پانی سیدھا میرے دائیں کان میں چلا گیا۔ اس کے باوجود اس نے وعظ جاری رکھا اور ہر بات کے اختتام پر کہتا ”جناب آپ کو کیا پتہ“ مجھے رہ رہ کر جہاں اس حجام کی طبیعت پر رشک آتا رہا، وہاں بار بار اپنی لاعلمی پر بھی سر شرم سے جھک جھک جاتا، جسے وہ فوراً پکڑ کر سیدھا کر دیتا۔

وہ جب اپنا استرا میرے اکلوتے گلے سے ”اوراں پراں“ کرتا، تو میں اپنا اختلافی بیان ریکارڈ کرا دیتا، اور جب وہ استرے کی طرف ہاتھ بڑھاتا تو میں فوراً اسے اپنی بھرپور حمایت کی یقین دہانی کرانے لگتا۔

اب اس کا ننھا شاگرد بھی دکان کے آخری بارڈر سے بیانات داغنے لگا تھا۔ کہنے لگا ”صاحب جی! ہم ڈیزائن والی داڑھی بنا کر اپنی روزی حرام کیوں کریں“ اس وقت وہ ایک بزرگ کی داڑھی بلیڈ کے ساتھ مونڈنے کے بعد اس پر ”بھنگڑوی رگڑ“ رہا تھا۔

غرض یہ کہ یہ قومی سطح کے دردمند حجام تو جوانوں کی عملی پستی سے بے حد دلبرداشتہ تھے۔

کرسی سے اٹھتے ہوئے میں نے پیسے حجام کی طرف بڑھا دیے اور بقایا لینے کے لیے اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں اس کا موبائل بجا، دوسری طرف بندے نے چھوٹتے ہی کہا ”میں پیسے لینے آ جاؤں“ اس نے جواباً کہا ”میں موٹر سائیکل چلا رہا ہوں، مجھے کچھ نہیں آ رہی کہ تم کیا کہہ رہے ہو“ اور مسلسل تین بار ہیلو ہیلو کہنے کے بعد نہ صرف کال کاٹ دی، بلکہ سرے سے موبائل ہی بند کر دیا۔ موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے اُسے درمیانے درجے کی دیسی گالی دیتے ہوئے کہا ”لوگ بڑے بے ایمان ہو گئے ہیں“

استرا بدستور اس کے ہاتھ میں تھا، چنانچہ میں زبان سے تو اسے کچھ نہ کہہ سکا البتہ دل ہی دل میں کہا ”بڑے استرے ہو“ اور بقایا لے کر سیر گشت کا بقیہ حصہ پورا کرنے کے لیے سڑک پر نکل آیا۔۔۔

☆☆☆☆☆

محمد ضیاالمصطفیٰ

ابلیس کے ایک نظم

شام کے چاند چاند شانوں سے
سرمئی شال یوں ڈھلکتی ہے
جیسے یہ آبشار تاریکی
دائرہ دائرہ بھگوتی ہوئی
مرمریں پنڈلیوں کو چھو لے گی

رات کے بے لباس پیکر نے
اپنی عریانیوں میں ڈھانپ لیا
شفقِ شام کا تنِ گل گوں
رات کی کھنکھناتی مٹی میں
صبح تک شام گنگناتی رہی
رات کی سخت گیر باہوں میں
شام سا تن تڑخ تڑخ اُٹھا
صبح دم شام کی شفق پھوٹی
دن اذانوں کے سائے میں نکلا
بام و در اک مہک سے گونج اُٹھے

ہر طرف اک ہما ہمی سی ہے
چار سو سات رنگ پھرتے ہیں
زرد روئی کھلے کواڑوں سے
چاند کا روپ دھار کر نکلی
ہر طرف چاند چاند چہرے ہیں

شام تھی وہ کہ صبح تھی ، اے جاں!
کچھ تو کہہ رات ہے کہ یہ دن ہے
کچھ تو کہہ اے مرے کھلے دشمن!
رات بھر کام کون کرتا ہے
دن بھر آرام کون کرتا ہے

خالد احمد

رُوپوش

وہ اپنے آپ سے روپوش
اک عرصہ سے حیراں اور پریشاں
دربدر کی ٹھوکریں کھاتا
بھٹکتا پھر رہا ہے
یاس کے کُوئے ملامت میں
بجز داغِ ندامت اس کے حصے میں
اثاثہ کچھ نہیں آیا
وراثت میں خوشی جاہ و حشم
سب کھو دیا اس نے
چڑھا کے خول اپنے رُخ پہ
اک بے جار عونت کا
لیے پھرتا ہے چہرہ ایک نقلی سا
سجی ہیں جس پہ دو آنکھیں
خیال و خواب سے عاری
کسی اُفتاد کی ماری
اُسے ڈر ہے
کہیں گنجِ قفس میں
چشمِ حیراں
درد کے انجام پہ خیرہ
چمک کر ماند پڑ جائے
یونہی روپوش ہو کر
غم کی سرحد پار کر جائے
کئی صدیاں گزر کر پھر
ورنا آشنا پر
"ہے" کی صورت
منکشف ہو کر
لب و رُخسار پر آئے
مقامِ دار پر آئے!!

سید افسر ساجد

سوچ آسمان مری

عدو نے
راہ بہت روکنے کی ٹھانی مری
نہ رک سکی
کسی صورت مگر روانی مری

ستم سب اپنوں، پرائیوں کے
جس طرح جھیلے
مثال بن گئی دنیا میں
سخت جانی مری

جمالِ گنبدِ خضرا سے ہے
مجھے نسبت
یہ ربط کرتا ہے
پل پل نگاہبانی مری

کسی ادھوری حقیقت کا
میں نہیں قائل
سفر زمیں پہ مرا
سوچ آسمانی مری

میں ایک راز ہوں
تہذیب کے تسلسل کا
رہے گی وقت سے آگے
سدا کہانی مری

نمودِ خیر کا نقشہ ہے
میرا پرچمِ سبز
فروغِ امن کا وعدہ ہے
کامرانی مری

لہو کی لَو میں جو عالی
سنبھال رکھی ہے
یہ دشت دیکھنے والا ہے
بیکرانی مری

جلیل عالی

خالی کمرے کی گونج

اے دھرتی کے اندھے باسی!
اب کیا ہوگا؟
کچھ تو ہوگا۔۔۔!!
کچھ ہونے کا مطلب لیکن تم کیا جانو!
تم دھرتی کے اندھے باسی اور
میں پوجا پاٹ میں بیٹھا اپنے خواب لٹا بیٹھا ہوں
جو کچھ بھوج مقدر میں تھا، کھا بیٹھا ہوں
ہر سو پھیلی ویرانی میں آ بیٹھا ہوں
لیکن تم کچھ اپنا سوچو!
دھن دولت سے حاصل کردہ بال نہ نوچو
آہنی ناخن بڑھ تو چکے ہیں، اب تم ان سے،
اپنے بدن کی کھال کھرو چو
شاید کھال کے اندر سے وہ خون برآمد ہو جائے
جو تم نے پیا تھا
مزدوروں کا، مجبوروں کا
شاید اس دھن دولت کی جو وحشت ہے،
کچھ کم ہو جائے
اور تمھاری آنکھ بھی میری آنکھ کی صورت نم ہو جائے
میرا کیا ہے!
میری چھوڑو!
میں اپنے اس آج میں گزرے کل کی
ضرورت بھگت رہا ہوں
اب تو میری سانسیں تک بھی رہن رکھی ہیں
آگے پیچھے، دائیں بائیں،
دیواریں ہی دیواریں ہیں
لیکن تم اتنا تو سوچو!
دیواروں کا اپنا کیا ہے
چھت کے نیچے کی دیواریں ہوں یا رستے کی دیواریں
دیواریں تو دیواریں ہیں
ہر دیوار کے ساتھ اک بندش لگی ہوئی ہے
رستہ روکنے والی دیواروں کا کام ہے، رستہ روکیں
گھر کی دیواروں کا کام ہے گھر کی سانجھ میں
بٹوارے کا بوجھ اٹھائیں
ہر اک گھر کی دیواروں میں خالی کمرے
گونج رہے ہیں
جنگل کی خاموشی جیسا سرد سماں ہے
کچھ نہیں کہتا۔۔۔کون کہاں ہے؟

خالد علیم

پہلی ملاقات

امّی!
میں نے تمھیں کبھی نہیں دیکھا
اتنا سُنا ہے
تم میری امّی ہو
اچھی اچھی امّی
پیاری پیاری امّی

پاپا بتلاتے ہیں
نشتر ہاسپٹل جانے سے پہلے
گھر کی چوکھٹ پر
تم نے آخری بار مجھے جب گود لیا
چُوما، اور پیار کیا تھا
میرا چہرہ تمھیں دیکھ کر کھل کھل اٹھتا تھا
میں ہنستی، کلکاریاں بھرتی،
ٹک ٹک تم کو دیکھتی جاتی تھی
تم روتی جاتی تھیں،
اور مسلسل روتی جاتی تھیں
دادی اماں نے جب مجھے تمھاری گود سے جدا کیا تو
میرا چہرہ
تم نے آنسوؤں کی رِم جھم سے دھو ڈالا تھا
تب میں اک ننھی منی سی دو سالہ گڑیا تھی

امّی!
برسوں بعد میں پہلی بار تمھیں ملنے آئی ہوں
مٹّی، گارے کی بے صوت و صدا،
اس دُور اُفتادہ بستی میں
پاپا کے بوجھل قدموں کے پیچھے
چلتے، گرتے، سنبھلتے
مٹّی کی اس ڈھیری تک
جس کے سرہانے
آج بھی اک کتبہ آویزاں ہے
جس پہ تمھارا نام لکھا ہے

امّی!
مجھ سے ملو
کہاں ہو تم!
میں تم سے ملنے آئی ہوں
پہلی بار تمھیں ملنے آئی ہوں

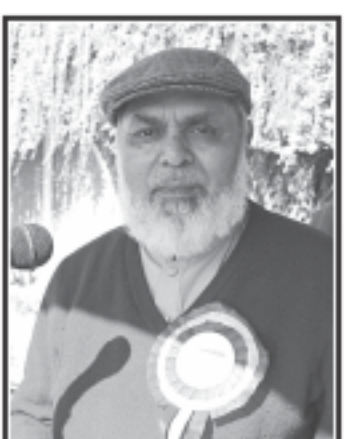

محمد انیس انصاری

نظم

صفدر صدیق رضی

نظم ایسی خوبرو دوشیزہ ہے

لفظ و معانی کے جواہر سے لدی

پیہم بنی سنوری

جو حرف و صوت کے روشن دریچے میں کھڑی

یوں منتظر ہے

کوئی عاشق آئے

اور اس کو اشارے سے بلائے

جس کی باہوں میں وہ باہیں ڈال کر

گھر سے دبے پاؤں نکل جائے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کھلا، یا، نہ کھلا میں

وقت

وقت کیا ہے

وقت مٹھی سے نکلتی ریت ہے

وقت ازل سے تا ابد اک لہلہاتا کھیت ہے

وقت تھم جائے تو پتھر

وقت لیکن جب رواں ہو، آب جو ہے

وقت رگ رگ میں تھرکتا، شور سا کرتا لہو ہے

وقت میں ہوں

وقت تو ہے

وقت بحرِ بے کنار اور

وقت دشتِ بے کراں ہے

وقت اسپِ بے عناں ہے

وقت ہی تو انتباہِ لاتسبّوا الدہر ہے

وقت اسباب و علل ہے

وقت ربِّ لم یزل ہے

نذر عابد

خیال وخواب

چاندنی کی نَم چادر سانس گُم نہ کر ڈالے
سرد سی ہوا میں دل برف ہی نہ ہو جائے
لوریاں سناتی ہے راگنی فضاؤں کی
شب بھی ٹھنڈی آہوں میں صَرف ہی نہ ہو جائے

دم بخود مناظر کو سُکھ کی کیا خبر ہو گی
بے قرار سی بدلی آسماں کا در ہو گی
خامشی کے لمحوں کی ایک سی ہے بے چینی
آنکھ ڈھل کے اشکوں سے بار بار تر ہو گی

چاند تیرا سایہ جب سر پہ عین آئے گا
خوشبوؤں کا جھونکا بھی ساری رین آئے گا
لاکھ دیکھ لیں سنگم خواب اور خیالوں کے
پریتما کی باہوں میں سو کے چین آئے گا

رخشندہ نوید

عدیم الفرصتی

کئی دن سے
مجھے آواز دیتے ہیں
وہ رستے اور گلیاں
جہاں گزرا مرا بچپن
بلاتے ہیں در و دیوار اس گھر کے
جہاں خوشبو بسی ہے میرے آبا کی
پکڑ کے انگلی والد کی جہاں سیکھا تھا چلنا
وہی آنگن مجھے کیوں ہر بار آواز دیتا ہے
وہ کمرے جن کی خاموشی میں اب بھی لوریاں ہیں
اور تھپکی ماں کے ہاتھوں کی
مجھے آواز دیتے ہیں
وہ دو نہریں
وہ نہروں کے کناروں پر
درختوں کے گھنے سائے
مجھے آواز دیتے ہیں
وہ اسٹیشن جہاں پر یونہی جا کے بیٹھا کرتے تھے
ٹرینیں اس پہ اب بھی آ کے رُکتی ہیں
مسافر بھی اُترتے ہیں
مگر اب ہم نہیں ہوتے
کئی دن سے وہ میرا شہر منٹگمری
مجھے آواز دیتا ہے
مگر اُلجھا ہوں روز و شب پھیلایا
مجھے فرصت نہیں ملتی
کہ اپنے آپ سے جا کر
میں مل آؤں

افتخار شوکت

ہمیں تم سے ملنے کی فرصت نہیں اب

ہزاروں جھمیلے
دکھوں کے ہیں ریلے
زمانے کے جھنجھٹ
جُدائی کے پنگھٹ
ستم کے اندھیرے
نہ دیکھے سویرے
اداسی کے ڈیرے
ہمیں اب ہیں گھیرے
محبت کے قصے
محبت کی باتیں
ہوئیں خواب ساری
ملن کی وہ راتیں
ایسے میں
ملیں تم سے آ کر!
ہمیں تم سے ملنے کی
فرصت نہیں اب

تسنیم کوثر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر رنج تری عطا تھا خالد
ہر دکھ اک در بے بہا تھا

نظم

کیا کیا پھر
عبادت گزار مصلیٰ نشین بیبیو!
فجر کے دھندلکے میں تلاوت کرنے والیو!
وضو کی شبنم لبوں پہ تسبیح
سند یافتہ باحجاب معتبر
باادب بانصیب بابرکت
عبادتوں میں لے کے سبقت
نیک عورتو اے نیک عورتو
مجھے بھی اپنے ساتھ لے لو
نہیں
میں دائم الصلوٰۃ نہیں ہوں
نہیں
کثیر السجود نہیں ہوں
"کیا کیا پھر؟" سوال حق ہے
درد جہاں درد جان بنایا
غم جہاں سے نہ سر اٹھایا
چوٹ جس کو لگی
درد مجھ کو ہوا
درد۔۔۔ بے حساب درد
دیوار پار دور پار کا درد
ہر بہار میں خزاں پائی
خزاں کو نا بہار لکھا
سرخ کو لہو فگار لکھا
داغ دار کو داغ دار لکھا
بند کر کے آنکھیں
خاموش رہنا
معتبر خرقہ پوش رہنا
سیکھا ہوتا اپنایا ہوتا
عمر کو نہ یوں گنوایا ہوتا

دردانہ نوشین خان

نثری نظم

حساسیت سے بڑا دکھ کوئی نہیں"

کوئی کسی کے لئے نہیں مرتا

جیسے کوئی کسی کے لئے نہیں جیتا

اپنی اپنی غرض میں مقید رشتے اپنی مدت پوری کر کے ایکسپائیر ہو جاتے ہیں

یہاں تک کہ کوئی

کسک باقی نہیں رہتی

کیونکہ ہم تعلق سے جو کشید کرنا چاہتے تھے کر چکے ہوتے ہیں

وقت لوٹ کر نہیں آتا

لوگ ملتے ہیں لیکن ہماری آنکھوں میں نادیدہ اجنبیت در آتی ہے

فاصلے اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ طے ہی نہیں ہو پاتے

ایکسپائری ڈیٹ کے بعد تعلق فقط

وقت کے ڈسٹبن میں پڑا تعفن زدہ وجود ہے

اس لیے تو حساسیت سے بڑا دکھ کوئی نہیں

جسے دنیادار ذہنی بیماری سمجھتے ہیں

نائلہ راٹھور

حادثوں کے منتظر

محبتوں کی بات ہو
چمکتا دن کہ رات ہو
کوئی بھی واردات ہو
کہیں پہ چاہے امن ہو بھلے کہیں پہ جنگ ہو
کوئی کسی کے سنگ ہو
زمین چاہے تنگ ہو
مگر عجیب لوگ ہیں کہ حادثوں کے منتظر
کھڑے ہوئے ہیں راہ میں
نجانے کس کی چاہ میں کہ سیلِ بے پناہ میں
یوں کر رہے ہیں انتظار
سب اپنی اپنی موت کا

نہ گفتگو، نہ مشورہ
کوئی تو ہوگا حادثہ
کیا ہوا ہے بند سب نے اپنا اپنا راستا
دلوں میں خوف ہے، یقین اٹھ گیا
مکان ہے وہیں، مکین اُٹھ گیا

مگر دلوں کے حادثے
جو سرحدوں پہ ہو چکے ہیں رونما
وہ سرحدیں جو دو دلوں کے بیچ ہیں
لکیر کھینچ دی گئی
وہ فاصلے کہ مختصر تھے اور اب طویل ہیں
کئی برس گزر گئے مٹے نہیں وہ فاصلے
چلے تھے اپنے گھر سے جو انہیں ملے نہ راستے
کھلی ہوئی ہیں کھڑکیاں
کھڑی ہوئی ہیں لڑکیاں
سڑک پہ کوئی بھی نہیں
فضا خموش ہر کہیں
دعائیں مانگنے لگے کہ لوگ جاگنے لگے
کوئی نیا ہو حادثہ
نظر تو آئے راستا
کہیں تو بات بیت ہو
اگر نہیں خوشی کا تو
غمی کا کوئی گیت ہو

عجب طرح کے لوگ ہیں جو پہلے سوچتے نہیں
کہیں بھی دیکھتے نہیں
جہاں پہ بولنا پڑے وہاں پہ بولتے نہیں
ہیں حادثوں کے منتظر
کہ حادثات ہیں امید کی کرن

ظہور چوہان

Satan World

وہ مجھے
تنہا
دیکھ کر
ایک رات
کمرے کی تنہائی میں
ملنے آئیں گے

اِس سے پہلے
کچھ سفلی حرکات وسکنات
سرزد ہونے کا ثبوت
اُنھیں مل چکا ہوگا

وہ
میری خواہش کا آسیب
ضرورتوں کے رنگ برنگ پھول
کمزوریوں کی فہرست
جانتے ہیں

وہ مجھے
اپنی عبادت گاہ میں لے جائیں گے
جہاں انسانیت کی تذلیل
من پسند قربانی
شیطانیت کی پرستش ہوتی ہے

دنیا میں
بہت سے نامور لوگ
اِن کے بہکاوے میں آکر
خدا سے لاتعلق ہو گئے

شیطان
مجھے جہنم میں جلتا دیکھ کر
قہقہے لگائے گا
جب کہ
میری آنکھوں میں
ندامت کے آنسو
خشک صحرا کی ریت ثابت ہوں گے

امجد بابر

سہ مصرعی نظمیں

جانے والے! تو جانتا ہی نہیں
کتنی دلگیر ہے ، یہ دیوانی
ہجرتوں کے ، اداس موسم میں

بن تیرے مجھکو چین کہاں
من موہنا ، وہ سنگیت نہیں
پہلی سی تیری پریت نہیں

کتنا خوش ہے وہ ایک فوٹو میں
میری میں بھی آیا، میرا کیک
میں اسے پھر بھی یاد نا آئی

آگ کے جلانے سے
روٹیاں پکانے تک
کتنے شعر ہوتے ہیں!!

کب ہو گا گیت مرا پورا
ہر بار کمی سی ، اس میں لگے
گر ساز ہے تو ، وہ میت نہیں

مایوس نا ہو کوکی!
آئے گی تری باری
کچھ بھی یہاں ہے ممکن

عمر بھر انتظار تو کر لوں
وقت کی ڈور کو یونہی کب تک
تھام کے روتی رہوں گی میں

آج پھر رابطہ ہوا ان سے
گزری باتوں پہ بحث کی ہم نے
آج پھر مجھ پہ شاعری اتری

کونسا جرم کر دیا میں نے؟
پھول کلیاں ہی دیکھنا چاہیں!
خواب آنکھوں کے چھن گئے میرے

ہر گھڑی بھروسے کو
توڑ کر گیا ہے وہ
میں مگر نہیں ہاری

کوکی گل

دل مضطرب

تجھے کیسے سمجھائیں اے دل مضطرب
تو انہونی خواہشوں کا تمنائی
اور وہ ہرجائی
گزرتا جارہا ہے
وعدوں پہ اعتبار کا موسم
خزاں رسیدہ آرزوؤں کے زرد پتے
آنے والے غمزدہ لمحوں کی
داستان سنا رہے ہیں
یہ روح کا دہکتا عذاب
میری ہر خوشی کو
اپنی لپیٹ میں لے کر
میری ذات کو مسخ کر رہا ہے
تجھے کیسے سمجھائیں
اے دل مضطرب
کہ رگ و پے میں
اترتا جارہا ہے
ہجر و فراق کا سلگتا عذاب،

قید

اس نے چھڑایا ہاتھ
تو
احساس ہوا
آج تک
اس خالی ہتھیلی پر
لمس کی صورت
قید ہے اسکا بوسہ

فصیحہ آصف خان

ہجر

ہجر توں کے موسم میں
جاہتوں کی اَن بَن میں
یاد کے دریچوں سے
اک ترے تصور کا
واہمہ سا ہوتا ہے
اور اِسی تصور میں
خواب ٹُوٹ جاتا ہے
خواب کے بکھرنے سے
خوش گمان لمحوں کا
مان ٹُوٹ جاتا ہے
اس بھرم کے رکھنے کو
زندگی کی پلکوں پر
آنسوؤں کی برکھا جب
گیت گنگنائے تو
صبح ہو ہی جاتی ہے
رات کٹ ہی جاتی ہے۔۔۔

دلشاد احمد

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

ہَوا میں رنگ نہ بھر دے مری اُڑان کہیں
وہ تیر چھوڑ نہ دیں کھینچ کر کمان کہیں

ایسی بستی میں رہتے ہیں جس میں

پوچھتے کیا ہو ، کیا بتاؤں میں
ایسی بستی میں رہتے ہیں جس میں
جوش والے ہیں لوگ جذباتی
چھوٹی سی بات پر بگڑتے ہیں
بھاری نقصان روز ہوتا ہے
جان سے لوگ ہاتھ دھوتے ہیں
ایسے اعلان روز ہوتے ہیں
مار ڈالا ہے بھائی بھائی نے
ہو گئے قتل باپ بیٹا بھی
زخمی رہ گیر بھی بہت سارے
جان دینا بھی جس میں معمولی
جان لینا بھی جس میں معمولی
ایسی بستی میں رہتے ہیں جس میں
دوستی بھی ہے انتہاؤں پر
دشمنی بھی ہے انتہاؤں پر
جس میں جھوٹی اناؤں کے ڈیرے
جس کی قبروں پہ پھول اور سہرے
جس میں بدلہ ضرور لیتے ہیں
بے گنہ کتنے مار دیتے ہیں
نسلوں تک چلتی دشمنی جس میں
پوتے لیتے ہیں بدلے دادوں کے
پکے ہیں لوگ یہ ارادوں کے
ایسی بستی میں رہتے ہیں جس میں
عورتیں بیوہ روز ، نت ہوتیں
اور بچے یتیم ہوتے ہیں
وعدے لاشوں سے لوگ کرتے ہیں
قتل کا بدلہ جلد لینے کا
حل نکالا ہے جرگے والوں نے
ختم ہوتی ہے بات ونی پر

عاصم بخاری

اضطراب

عظمیٰ نقوی

کئی دنوں سے
کہاں پہ گُم ہو!
سبھی کتابوں میں ڈھونڈ ڈالا
قدیم شیلفوں کو کھوج ڈالا
وہاں نہیں ہو
پُرانے البم بھی دیکھ ڈالے
نئے پرانے سبھی رسالے، تلاش ڈالے
یہاں نہیں ہو، وہاں نہیں ہو
کہیں نہیں ہو

بصارتوں سے سماعتوں تک کی راہداری
عجیب وحشت میں اَٹ چکی ہے
کوئی اُداسی سی دُھند بن کے
مرے بدن سے لپٹ رہی ہے
دِیا جلایا
بُجھا کے دیکھا
کہیں نہیں ہو، کہیں نہیں ہو

نظم

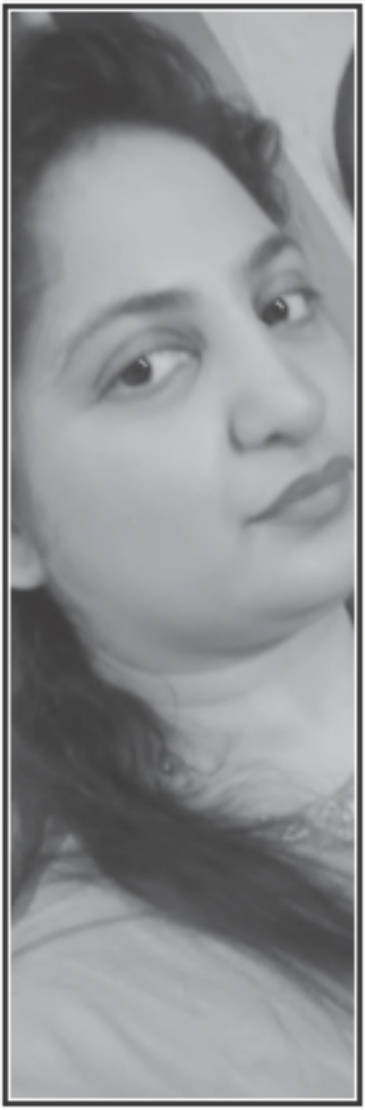

ادھوری پیاس بھی پاگل پن ہے۔۔

جلتے بدن پر تیری یاد کی اجرک چمک رہی ہے

یاد کوئی ساون کی جھڑی ہے

برسے تو جل تھل ہو جائے؟؟

وصل اور تیرے لمس کی خوشبو

پانی میں شامل ہو جائے۔۔۔

یہ تو ہے اک تیل کی دھارا

مدھم جلتی آگ سے مل کر

بھسم کرے گی

ختم کرے گی

محرمِ دل تم

خواہشِ دل سے ٹوٹ کے ہوتے چُور بدن پر

دستِ شفقت پھیرتے جاؤ۔

وقت کڑا ہے!!!!

جیسے دیکھو

دور گگن پر اُمڈ رہی ہے کالی بدلی

حبس بڑا ہے!!!

کشمالہ گیلانی

نظم

ہم کہیں پھر ملیں گے
کسی اور وقت، کسی اور زمانے میں
جہاں مجبوری کا کوئی دھاگہ
نہ تم سے بندھا ہو نہ مجھ سے
جہاں تم آزادی سے سانس لو گے
اور میں اپنی مرضی سے جی سکوں گی،
جہاں اک نظر دیکھنے کو
ہزار جتن نہ کرنے پڑیں
جہاں دکھ سکھ بانٹنے کے لئے
سماج کی اجازت درکار نہ رہے
جہاں تم فرصت کے کچھ پل
مجھے دان کر سکو۔۔۔
جہاں گردشیں پیروں سے نہ لپٹیں
جہاں خواب تشنگی نہ بڑھائیں
اگر تم نے پورے جی سے چاہا تو
ہم کہیں پھر ملیں گے۔۔۔۔۔

شمیلہ سعید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مرے حالات مجھ کو چھو نہ پائیں
مجھے ہر حال میں انسان رکھنا

نظم

شائستہ رمضان

درد تو درد ہے کچھ دیر میں ہی جائے گا

نقش اس کا کبھی ابھرے گا کبھی جائے گا

جیسے بارش کبھی رم جھم کبھی برسے کھل کر

ایسے میں یاد کبھی کم کبھی بڑھ جاتی ہے

میرے ہونے کا پتا میرے سوا کس کو ہے

یہ پہیلی مجھے ہر روز ہی الجھاتی ہے

نیا موسم یہاں آیا ہے گزر جائے گا

اس کا بدلاؤ بھی کچھ دیر ہی میں بھائے گا

کون کس کے لیے کب جلتا دیا بنتا ہے

آندھی آ لینے دو عقدہ یہ بھی کھل جائے گا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

یہ لوح ! خط زیست میں تحریر تھی خالد
میں نے یہ ہتھیلی کی لکیروں میں پڑھی تھی

کٹھ پُتلیاں

لوگ پاگل سمجھنے لگے ہیں مجھے!

میں نے ایسی کوئی بات کی تو نہیں
پھر بھی کیا ہے کہ
دفتر میں، گھر میں سبھی
میرے بارے میں
حیرت بھری گفتگو کر رہے ہیں!

میری جانب بڑے طنز سے
دیکھتے ہیں سبھی
زیرِ لب مسکراتے ہوئے
دھیرے دھیرے وہ آپس میں
کہتے ہیں کچھ!
کوئی پاگل ہوں میں!!
کوئی پاگل ہوں میں؟

یہ جو میں
گھر میں، دفتر میں اور شہر میں
اپنے بارے میں کچھ کہتا سنتا نہیں
یہ کٹھن کام ہے!

ایک چکر ہے

کٹھ پتلیاں
صبح سے شام تک
ڈوریوں کے سرے تھامے
ہاتھوں کی تحریک پر
کارِ انجام سے بے خبر.....!
میرے جیسے کئی.....!
آنکھ کھلنے تلک
دوسروں کی طرف دیکھتے، سوچتے ہیں بہت
ہنستے ہنستے، مگر.....!
کوئی پاگل ہوں مَیں؟

نوید صادق

خواب صحرا اور ہم

خواب روٹیوں میں ڈھل گئے
اور روٹیاں تقسیم ہو گئیں
خواب پانی ہو گئے
اور پانی ندی نالوں میں گم ہو گیا
خواب گندم میں ڈھلے
اور گندم پرندوں نے کھا لی
خواب آنکھوں میں بسے
اور آنکھیں صحرا بن گئیں،
خواب تعبیر تک آئے
تو ہم خود خواب بن گئے،

اعجاز رضوی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

زُلفیں کھول کے رنجوری کی
کس کے دُکھوں کی مشہوری کی

ابتسام
اکرم کنجاہی

قلم میں بند 15 سال
امتیاز گلیانوی

مجھے ستمبر پسند ہے

حسنِ خامشی

تشبیب
خالد احمد
ایک مٹھی ہوا
خالد احمد
جدید تر پاکستانی ادب
خالد احمد
دراز پلکوں کے سائے سائے
خالد احمد
خالد احمد